صریرِ خامہ

ادبی کالموں کا مجموعہ



محمد سلیم سالکؔ





صریر خامہ

(ادبی کالموں کا مجموعہ)

کالم نویس

محمد سلیم سالک

کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، دھلی

ISBN : 9789387884540

عنوان : صریر خامہ

نوعیت : ادبی کالم

کالم نویس : محمد سلیم سالکؔ

باراول : 2019

قیمت : 300روپے

تعداد : 500

کمپیوٹر کتابت : بشارت احمد بابا

سرورق : شاہ طارق

ناشر : کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 9958380431

:کتاب ملنے کا پتا: —

Mohammad Salim Salik
Editor **" Sheeraza Urdu"**
J&K Academy of Art, Culture and Languages
Lal Mandi, Srinagar, 190008 (J&K)
Mob: 9419711330
Email:salimsalik2012@gmail.com

انتساب

ریاست کے مایہ ناز اردو کالم نویس
مرحوم عبدالرحمان مخلص
اور
صاحب اسلوب اردو شاعر
مرحوم رئیس الدین رئیس
کے نام
جنہوں نے مجھے
ہمیشہ اپنی شفقتوں سے نوازا...

فہرست

.........☆☆☆.........

صریر نہیں سنگیت

صحافت بس ایک روز کا ناشتہ مانی جاتی ہے۔ شام تک اخبار کے صفحے شکن آلود اور اس کی عبارت باسی ہو جاتی ہیں۔ یہ زیادہ اخبار کے پہلے صفحے کے بارے میں دُرست ہے، لیکن اندر کے کالم اپنے متن اور مفہوم سے اس بیان کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ خبر میں نظر کا نشہ اور فکر کا کیف مل جائے تو وہ ایک دو آتشہ کالم بن جاتا ہے۔ ہماری ریاست کے علاقہ پونچھ کے چراغ حسن حسرت کو ہی لیجئے۔ وہ وطن ترک کر کے لاہور پہنچے تو انہوں نے وہاں ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' وغیرہ اخبارات کو الف لیلیٰ کے سند باد جہازی کی طرح ہیرے موتیوں سے سجا دیا۔ ان کا کالم اسی قلمی نام سے چھپتا تھا۔ اُردو میں انیسویں صدی کے ''اودھ پنچ''، بیسویں صدی کے عبدالمجید سالکؔ، ایاز میرؔ، فکر تونسوی، عائشہ جلال اور خالد حسین مرحوم کے کالم لگاتار چھپتے اور پسند کئے جاتے تھے۔ خود کشمیر میں اردو کالم نویس بھی اپنا لوہا منواتے رہے۔ مولانا مسعودی، تبسم کاشمیری، نندلال واتل، حسن زینہ گیری، گنگا دھر بٹ دیہاتی وغیرہ۔ اس وقت بھی حسن زینہ گیری، کرشن دیو سیٹھی وغیرہ کے کالم شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ فی الحال کشمیر میں اردو پیلیا یعنی یرقان کی مریض ہے۔ اس لئے اچھے کالم نویس اس سے زیادہ دامن بچانے کی ہی کوشش کرتے ہیں، لیکن ہمارے انگریزی اخبارات میں تو وہ چھائے ہوئے ہیں۔ زاہد غلام محمد، ڈاکٹر جاوید اقبال، عبدالمجید زرگر، فردوس سعید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے چند اخبارات جیسے

''کشمیر عظمیٰ''، کالم نویسوں کے لئے حاضر رہتے ہیں۔ ایسے کالم نگاروں میں سلیم سالکؔ بھی نمایاں ہیں۔ زیر نظر کتاب میں سالکؔ نے گزشتہ چار برسوں میں اپنے منتخب شائع شدہ کالموں کو اکٹھا کر کے شائع کیا ہے۔

کالم ہلکے پھلکے اور خندہ جبینی سے اظہار کی جانی والے آراء یا تبصروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جن میں لکھنے والا رواں دواں انداز میں تازہ واقعات اور شخصیات پر اپنے خیال پیش کرتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے ایک اور مقامی کالم نویس مرحوم عبدالرحمان مخلص کے کالموں پر مشتمل کچھ کتابیں دیکھی ہیں اور اپنی آوارہ قلمی کی وجہ سے ان پر رائے زنی بھی کی ہے۔ سالکؔ کے تازہ مجموعے کو دیکھ کر میری یہ امید تازہ ہوگئی ہے کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی ابھی زرخیز ہے ساقی'' (علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)۔

اس کتاب میں ہمارے دیکھے بھالے حالات اور جانی پہچانی شخصیات کے بارے میں سرگوشیاں کی گئی ہیں۔ ہلکے پھلکے انداز اور مختصر مختصر اشاروں کنایوں میں۔ زبان بہت سہل اور سنبھلی ہوئی اور ذکر و فکر لیکن بہت شریفانہ۔ اگرچہ یہ موضوع ابھی تازہ اور گرما گرم ہیں اور شخصیات جانی پہچانی۔ اس لئے ان کو ضرور پڑھا جائے گا اور قاری کو پڑھنے کے لئے آمادہ کرنا بھی اب کارے دارد بن گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ حوالے کے قلم پارے بھی بن جائیں گے اور آئندہ نسلیں آج کے اوقات اور افراد کو جاننے پرکھنے کے لئے ان کی تلاش بھی کریں گے۔ سالکؔ کی کاوش آج کی شعر گوئی سے بھرپور اور مقالہ نگاری سے بوجھل فضا میں ننھی تتلیوں کی مختصر پرواز کی طرح دل کو بھاتی اور نظر کو لبھاتی ہے، لیکن جیسا کہ اس صنف سخن کا خاصہ بلکہ پہچان ہے، اس میں درج اطلاعات کو مزید کھنگالنے کی ضرورت بھی پڑتی رہتی ہے۔ مثلاً حکیم منظورؔ مرحوم کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ بہاؤالدین صاحب کے پاس مدفون ہیں جبکہ وہ اپنے آبائی گھر گوجوارہ میں آخون صاحب کی زیارت کے ساتھ ملحق زیارت کے قبرستان میں آسودہ ہیں۔ یا ''تیرے بدلے جوش مرنے کے لئے تیار ہے'' والے کالم میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ساتھ لاہور میں علامہ اقبال کی مختصر سی گفتگو

میں کہا گیا ہے کہ پرتاب سنگھ نے انہیں ''بیت'' سنانے کو کہا۔ جبکہ ''بیت'' فارسی لفظ ہے اور پرتاب سنگھ پورا ان پڑھ تھا۔ مہجور کو یہ واقعہ منشی محمد الدین فوق نے سنایا تھا اور انہوں نے مجھے۔ جب پرتاب سنگھ کو بتایا گیا کہ اقبال ''بیت'' کہتے ہیں تو مہاراجہ ہکا بکا رہ گیا اور اپنے ڈوگری مصاحب سے پوچھا ''بیتیاں کی ہوندا''۔ ڈوگری مصاحب پرتاب سنگھ کے مبلغ علم کا واقف تھا۔ اُس نے اُن کو سمجھایا اور ڈوگری میں کچھ کہا۔ یہ سن کر پرتاب سنگھ زور سے سر ہلانے لگا اور کہا ''بھلے بھلے۔ تکان لکھدا ہے''۔ تکان ڈوگری میں تک بندی کو کہتے ہیں کہ انہیں بیت کا علم ہی نہ تھا۔ ڈوگری میں ادب کی پہلی کتاب 1944 میں ہی چھپ کر سامنے آسکی۔ بہر حال یہ بہت چھوٹی باتیں ہیں اور کالم نگاری کی رواداری کا حصہ ہے لیکن کتاب کے اکثر کالم معلومات افزائی اور شگفتہ نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً فرید پربتی مرحوم پر کالم ''زندہ تھا موت سے ہم آغوش رہا''۔ فرید مرحوم بہت خوش گوار و خوش قامت اور خوش گفتار آدمی تھے۔ اس کی جوانمرگی سے شعر وادب کے بہت امکان بھی بجھ گئے اور اس کے دوستوں کو بھی بہت صدمہ ہوا۔ سالک نے ان کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے، اس کو پڑھ کر فیض کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔

''کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے''

میرے خیال میں یہ مجموعہ ہماری اردو نگارش کی ایک عمدہ اور قاری نواز سوغات سجا کر آیا ہے اور اسے مزے لے لے کر پڑھا جائیگا۔

ابھی کچھ زندگی کا آسرا ہے
چراغوں میں ابھی کچھ روشنی ہے

— محمد یوسف ٹینگ

......●......

نئے لکھنے والوں کو سلام

جب بھی روزانہ یا ہفتہ وار کالموں کی بات چلتی ہے، تو میرا ذہن آدھی صدی اُدھر روزنامہ ''ملاپ'' کے کالم ''پیاز کے چھلکے'' کی طرف جاتا ہے۔ بیسوی صدی کے چھٹے دہے تک یہ کالم ملاپ لاہور سے تقسیم ملک کے ساتھ فکر تونسوی دہلی منتقل ہوا تھا۔ ملاپ کا کافی اثر تھا اور تقسیمِ وطن کے بعد ''پیاز کے چھلکے'' ہر اُردو دان کے گھر دکان، رکھشے یکے، یہاں تک کہ شایقین کی سائیکلوں کے کریر پر دکھائی پڑتے تھے۔ جب دہلی سے اُردو کا خاتمہ ہوا، تو ہند سماچار نے کالم نویسی کو پناہ دی اور دیر تک اس کی سرپرستی کی۔ لاہور کے اخبارات کا سلسلہ کشمیر سے ایسے ٹوٹا تھا، جیسے مظفر آباد سے شہرِ سرینگر کا۔ ہم ہند سماچار اور وحدت پر اکتفا کرتے رہے، بعدازاں وہ بھی اپنی عمر کی کچھ سیڑیاں چڑھنے کے بعد تھک ہار کر گمنامی کے اندھیروں میں کھو گئے۔ اس دوران کشمیر کی اردو صحافت پریم ناتھ بزاز، محمد سعید مسعودی اور دیگر حضرات کے ذریعے پروان چڑھی اور 1947ء سے 1953ء تک کے پُر آشوب دور میں بے معنی صحافت کا ایک سیاہ دور سامنے آیا۔ 1964 کے بعد کشمیر میں پھر سے سیاسی سرگرمیوں کا دور دورہ ہوا، تو صحافت ایک انگڑائی لیکر گلشن کشمیر میں پھر سے نمودار ہوئی۔ دو اخبارات جو ہفتہ روزہ تھے، اس ضمن خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ شمیم احمد شمیم کا ''آئینہ'' اور میر غلام رسول نازکی کا ''الغفران''۔ شمیم کے تیسرے صفحے کی قارئین کو لت لگ گئی تھی اور نازکی

صاحب کے شذرات جو پہلے صفحے کی زینت ہوا کرتے تھے، کئی اخبارات میں قندِ مکرر کے طور پر شائع ہوتے تھے۔ کالم بینی کا فن ہر کسی کا من بھاتا ہی سہی مگر کالم نگاری ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کالم نویسی کے لئے ایک وسیع النظر اور ہمہ جہت تخلیقی، تحقیقی اور ادبی جھکاؤ سے لبریز ذہن کا ہونا ضروری ہیں۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے معروف رسالہ انشاء کے مدیرف۔س۔ اعجاز اپنی تصنیف ''گفتنی'' کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔

> ''اخبار میں کسی واقعہ پر فوری ردِ عمل کو ضبط تحریر لا کر ایک سوچ کا سِرا لوگوں کو تھما دینا مقصود ہوتا ہے۔ وہ بھی اِس طرح کہ مالکان کی پالیسی سے کوئی تحریر متصادم نہ ہو، چند روز بعد صورتحال بدل جائے، تو اخبار اس پوزیشن میں ہوتا ہے، کہ updates کے ساتھ دوسرا اداریہ پیش کر دے۔''

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:۔

> ''واقعاتی اور فکری تسلسل پر زیادہ انہماک سے کام لینا پڑتا ہے۔ کالم نگار کے سامنے متنوع مضامین، بوقلموں واقعات اور حالات کا بھنڈار موجود ہوتا ہے، اِس میں سے انتخاب کرنا اور پھر کالم نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنا کارے دارد والا معاملہ اُس وقت بن جاتا ہے جب ایک کالم نگار ایڈیٹوریل سے متصادم نہ ہوتے ہوئے، اپنا نقطہ نظر قائم رکھنے کے مرحلے سے گزرتا ہے۔''

جدید تر لکھنے والوں میں جاوید آذر نے ہفتہ روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں ایک نئے اسلوب سے فکاہیہ کالم'' خدنگ جستہ'' میں نھا ترڈا کے کردار کو اونچائی کی پرواز کرنا سکھایا۔ اس کے بعد ایاز رسول نازکی نے روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں

''حاصل ضرب'' لکھ کر طنزیہ ادب میں ایک اضافہ کیا۔

آج میرے سامنے جو کتاب پیش لفظ کے لئے پیش ہوئی، اُس پر کچھ لکھنے یا فیصلے صادر کرنے سے پہلے اِس پسِ منظر کو ابھارنا ناگزیر تھا۔ حکایت لذیز ہے اس لئے مزے لے لے کر بیان کرر ہا ہوں۔

''صریرِ خامہ'' سلیم سالک صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، میں کشمیر عظمیٰ میں اُن کے کالم کو تواتر اور باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں۔ درحقیقت اسی کالم کی وساطت سے میری اُن کے ساتھ رسم وراہ پیدا ہوگئی۔ اُن کا ایک کالم پڑھ کر میں نے یونیورسٹی میں ایک ادبی تقریب میں سلیم سالک کو تلاش کیا اور اُن سے بغل گیر ہوا۔ اس طرح میں اُن کے پرستاروں کی صف میں شامل ہوگیا بقولِ شاعرؔ

وہ ملاقات تعارف سے زیادہ تو نہ تھی
ہوگئی معنی کی تشہیر بڑی مشکل ہے

کالم نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہرفن مولا ہو، جس موضوع کو چھیڑے، اس کے بارے میں اسکی معلومات کا ہونا لازمی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سیاست سے لیکر عمرانیات کے ہر شعبے میں ماہرانہ دسترس رکھتا ہو۔ مگر جس بات کو چھیڑے، اس طرح چھیڑے کہ اس کی مبادیات سے واقف لگے۔ ادبی کالم نگاری کا خمیر طنز، ظرافت، بیان اور اسلوب سے اٹھتا ہے۔ اِن عناصر سے تحریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، ظرافت کی چاشنی سے تلخ سے تلخ موضوع بھی قابل قبول بن جاتا ہے۔ سالکؔ کے یہاں سنجیدہ ظرافت کے کئی نمونے ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں طنز و تشنیع کے نوکیلے نشتر نہیں ہیں۔ اُسکی ظرافت قہقہوں کے بجائے زیرِ لب مسکراہٹوں کو جنم دیتی ہے۔ جس سے قاری کا چہرہ فرط وانبساط سے سے ٹمٹما اٹھتا ہے۔ مغربی ظرافت کا یہی تصور ہے۔

سالک کی تحریر اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ادبی موضوعات، شخصیات اور روز مرہ کے واقعات کو ایک نئے انداز سے ابھارنے اور اُن کی اہمیت اور افادیت کو آشکار کرنے میں کسی سے کم نہیں۔ سالک کی کتاب ''صریر خامہ'' اسمِ با مسمیٰ ہے اور اس میں بارہا، مضامین غیب سے آنے کا گماں بھی گزرتا ہے اور کئی مقامات پر نوائے سروش کی سرگوئیاں بھی سنائی دیتی ہیں۔

بات سے بات پیدا کرنے کا یہ ہنر ہمارے قدما کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس طرح کے اندزِ بیان سے مضامین کو غیب سے لانے کا عمل کامیاب ہوتا ہے اور اسلوب کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک مختصر سے کالم میں آگہی کے بیش بہا خزانوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور قاری چند منٹوں میں معلومات کے خزانوں کا مالک بن جاتا ہے۔ نہ کلاس روم کی صعوبت اور نہ لابریری میں کتابیں پلٹنے کی زحمت۔ ایسے مضامین کم خرچ اور بالا نشین کہلاتے ہیں۔ ظرافت، شرافت، نجابت، خطابت، یہاں تک کہ عداوت کا کونسا پہلو ہے، جو انسان صفات و عیوب کی نشاندہی کرتا ہو اور سالک نے اُس پر خامہ پرسائی نہ کی ہو۔

اگرچہ سالک نے اپنے تمام کالم کشمیر میں بیٹھ کر سپردِ قرطاس کئے ہیں اور بیشتر مضامین میں مقامی رنگ بھی زیادہ چوکھا ہے، بہ ایں ہمہ اُس کا کینواس کافی وسیع ہے اور دنیا کے بدلتے ہوئے رنگوں سے اپنی تصویریں بناتا ہے۔ اس کی قلمی تصویروں میں خاکے کی ٹیڑھی میڑھی اور سیدھی لکیریں بھی ملتی ہیں۔ بیانیہ میں آج کے سماج کے کسی نہ کسی پہلو یا کردار کی آئینہ داری بھی ہے اور علمی مسائل اور موضوعات پر نپی تلی اور متوازن بحث بھی ہے۔ پطرس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ عہدِ حاضر کے ادیب کی مجبوری بن گئی ہے کہ وہ معاشرے کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی اُس کا حصہ بن جانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ دراصل وہ زندگی کی تیز رفتاری میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ

ساری عمر مکان کی تلاش کرتے کرتے بھول جاتا ہے کہ وہ مکان حاصل کر کے اس میں زندگی کب شروع کرے گا۔ پطرسؔ نے یہ باتیں آج سے لگ بھگ ستر برس پہلے کہیں تھیں۔ تب سے زندگی نے کئی کروٹیں بدلی ہیں۔ ریڈیو سے ہم ٹی وی میں آ گئے۔ زمینی فاصلے سمٹتے گئے۔ مگر دلوں کے درمیان ناقابلِ تسخیر دراڑیں پڑ گئیں۔ اب سفر آسان ہو گیا ہے مگر تعلق خاطر کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اِن مسائل سے آج کا ادیب خاص کر کالم نگار لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ وہ مشاہدے کے لئے اپنی آنکھیں معاشرے کو وقف کر دیتا ہے اور بطون میں ہونے والی تبدیلیوں کو دل میں چھپائے، الفاظ کو نئے معانی پہنانے میں خود فراموشی کے صبر آزما مرحلوں سے گزرتا ہے۔

ایک کالم میں قدرے غیر معروف شاعر سلیم زاہدؔ کا ذکر ہے۔ سالک ایر پورٹ پر اپنے اس دوست کو Receive کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہاں اُن کا تعارف رفیق راز سے ہوتا ہے اور مرحوم غلام نبی شیخ سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس تحریر میں رفیق راز کی غزل، غلام نبی شیخ کی گائیکی اور بے وقت موت۔ اور سلیم زاہد سے مراسلت اور اُن کے گردوں کی تکلیف کے بارے کافی معلومات ہیں۔ لیکن سلیم زاہد کی پذیرائی کا شرف سالک کو نصیب نہیں ہوا۔ مضمون میں شمس الرحمان فاروقی صاحب کا سنہری حروف میں تذکرہ ہے۔ مگر سلیم زاہد کی راہ دیکھتے رہ گئے۔ جن کے حوالے سے کالم شروع کیا گیا تھا۔ اِس طرح کی کئی تحریریں، سالک کی کتاب میں موجود ہیں۔ جن میں عہد حاضر کی چل چلائی والی اضطراری کیفیت، رشتوں کی اصلیت اور اچھے اور بُرے کا ادغام صاف نظر آتا ہے۔ سلیم سالک کی تحریریں دیکھ کر مجھے مشہور روسی مفکر اور مصنف ترگنیف کی یہ بات یاد آ گئی کہ وہ صرف اِس حالت میں لکھ سکتا تھا کہ میز کے نیچے اس کے پاؤں گرم پانی کی بالٹی میں ہوں اور اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہو اور وہ کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھا لکھ رہا ہو، آرتھر کو سلر

(Althar Koisler) نے اس کی تشریح یوں کی تھی، گرم پانی کا بالٹی، وجدان یا تخلیقی سرچشمے کا مظہر تھی اور کھلی ہوئی کھڑکی بیرون دنیا۔ یا فن کار کی تخلیق کے لئے خام مواد۔ اُس نے یہ بھی واضح کردیا کہ دنیا کی سب سے بڑی ترغیب اُس مصنف کے لئے یہ ہوتی کہ وہ پردے کھینچ دیتا اور پٹ بند کردیتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے نمبر کی ترغیب بھی تھی۔ جس میں کھلی ہوئی کھڑکی کا عمل دباؤ کی صوت میں نہیں بلکہ کشش کی صورت اختیار کرتا۔ یعنی مصنف کا جی پٹ بند کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ گرم پانی کی بالٹی سے پاؤں باہر نکال کے کھڑکی سے جھک کے باہر جھانکنے لگتا ہے۔

ہمارا اردو ادیب سڑک کے ہنگاموں کو لکھنے کی اتنی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ہم اُسے اکثر کھڑکی کے پاس کھڑا، باہر کے منظر سے مسحور جھانکتے ہوئے پاتے ہیں۔

سلیم سالک کی کتاب پڑھ کر میرا مجموعی تاثر میں نے پطرس کی مندرجہ بالا اقتباس کے ذریعے آپ پر واضح کردیا ہے۔ سلیم سالک کھڑکی میں جھانکتا بھی ہے، بھیڑ میں شامل ہوکر کبھی کبھار غل بھی مچاتا ہے، اور کبھی کبھی ایک خاموش شاہد کی طرح مشاہدات کے موتی چن چن کر اپنی تحریر کے دامن میں سجاتا اور پڑھنے والوں سے داد و تحسین سمیٹتا ہے۔

اس کے پھرن کے نیچے گرم کانگڑی سلیم سالک کا وجدان ہے اور کھڑکی کی جالی سے جھانکتی تیز رفتار گاڑیاں اور نرم روشکارے اور کبھی کبھی تیز رفتار موٹر سائیکل اور سبزہ زاروں کو مرتعش کرنے والی میٹرو، اس کی تحریر کا خام مواد ہے۔ اس کی خورد بینی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اس لئے اس کی تحریریں معنوی اور موضوعاتی اعتبار سے قابلِ حد تحسین ہے۔

— فاروق نازکی

……●……

'صریرِ خامہ' - کشمیر کے اردو ادب کا دریچہ

محمد سلیم سالک دشتِ ادب کے سالک ہیں۔انھوں نے کشمیر میں اردو ادب کی بازیافت کی خاطر اپنی زندگی وقف کی ہے۔ وہ نہ صرف تنقید و تحقیق نگار ہیں بلکہ صحافت کے ساتھ بھی جڑے ہیں۔ان کی تازہ تصنیف 'صریرِ خامہ' ادبی کالموں کا مجموعہ ہے جو مقامی روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور اب کتابی صورت میں پیش ہورہے ہیں۔اس سے قبل بھی سالک کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جیسے 'فرید پربتی : شعر، شعور اور شعریات' [۲۰۰۶ء]، 'کتاب دریچہ' [ادبی کالموں کا مجموعہ، ۲۰۰۹ء]، 'عمر مجید کے بہترین افسانے' [۲۰۰۹ء]، 'جموں و کشمیر کے منتخب اردو افسانے' [پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک ، ۲۰۱۱ء] اور 'اردو افسانہ: مزاج و منہاج' [ادبی مذاکرے ۲۰۱۷ء]۔سلیم سالک (اصل نام: محمد سلیم خان) کی ولادت سرینگر کشمیر میں ہوئی ، انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں اور آج کل جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز میں ملازمت کررہے ہیں۔اکیڈیمی کے اردو ماہنامہ 'شیرازہ' کے مدیر بھی ہیں۔

'صریرِ خامہ' میں ابتدائی تعارفی مضامین کے علاوہ انتیس مضامین شامل ہیں جو اس سے پہلے کالموں کی صورت میں شائع ہوچکے ہیں۔ چنندہ مضامین اردو ادب

کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ادبی اصناف کی خصوصیات، افسانہ نگاری کی مبادیات اور نامور ادیبوں وصحافیوں کی سیرت نگاری۔ ان نگارشات کو کالم نگار نے غالبؔ اور دیگر شعرا کے اشعار سے یوں مزین کیا ہے کہ اشعار نثری بیانیہ کا درپن بن جاتے ہیں۔ کئی جگہوں پر انھوں نے ظریفانہ انداز اختیار کیا ہے اور طنز سے بھی کام لیا ہے۔ بقول کالم نویس 'ادب برائے ادب' اور ادب برائے زندگی' کے علاوہ عہد حاضر میں ایک اور نظریہ 'ادب برائے سیاست' استعمال ہوتا ہے جس کے توسل سے ناشاعر مسند نشین ہوجاتے ہیں اور کم ظرف انعام واکرام پاتے ہیں۔ کتاب میں شامل اکثر تحریریں تجرباتِ حوادث سے شروع ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ اصلی مدعے پر مرتکز ہوتی ہیں جس کے باعث مصنف کی ادبی زندگی کے تلخ وترش واقعات اور ارتقائی منزلیں سامنے آتی ہیں اور ساتھ ہی قاری کو ان کی سوانحی جزئیات کا علم ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نگارشات میں ایک ذاتی ذائقہ ملتا ہے جو قاری کی دلچسپی کو دوبالا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سلیم سالکؔ فرماتے ہیں کہ انھوں نے نثری نظمیں لکھنے کے دوران بنگلور کے ایک مقبول شاعر سلیم زاہدؔ سے رابطہ کیا اور ان کی شاگردی قبول کی۔ شومیٔ قسمت یہ کہ بہت عرصہ بعد سلیم زاہدؔ نے مشاعرے کے سلسلے میں کشمیر آنے کا ارادہ کیا اور سالک ائیر پورٹ پر ان کی راہ تکتے رہ گئے کیونکہ اُدھر بنگلور میں زاہد صاحب نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ نجی زندگی کو سماجی زندگی سے جوڑ کر سالکؔ نے گلدستہ ہائے پیش کیے ہیں اور وادی کی اجتماعی زندگی سے غیر ارادی طور پر روشناس کرایا ہے۔ ایک جانب وادی کی ادبی انجمن 'کہکشاں' کی روداد ملتی ہے اور دوسری جانب فلم 'شعلے' کے وقت بجلی چلے جانے کے سبب لوگوں کے احتجاج کا منظر رقم کیا ہے۔ بہر کیف کالم نگار نے محض ذاتی تجربات سے کام نہیں لیا ہے بلکہ موضوع کی گہرائی ناپنے کے لیے اس پر کافی ریسرچ بھی کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مشتاق

مہدی کی ہدایت قلم بند کی ہے کہ ''کوئی وہ لفظ جس کا صحیح معنی معلوم نہ ہو، کبھی بھی نہ لکھیں۔'' میں ان کی اس ہدایت سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میرا ماننا ہے کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی لفظ آتا ہے جس کا مفہوم واضح نہ ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ کسی اچھی سی لغت سے استفادہ کر کے اس کے اصلی معنی، املا، تلفظ اور استعمال کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں، اس طرح وہ لفظ اپنے سیاق وسباق کے ساتھ عمر بھر آپ کی یادداشت کا حصہ بن کر رہ جائے گا۔ بازار میں ایسی کئی لغات دستیاب ہیں جن میں ہر لفظ کے تحت اساتذہ کے اشعار درج ہیں جن سے ایسے الفاظ کا صحیح استعمال سمجھ میں آتا ہے۔ خیر یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ کتاب میں شامل اکثر و بیشتر مضامین وادیِ کشمیر کے ادیبوں اور ادبی فضا سے تعلق رکھتے ہیں اور کشمیر کے ادبی تناظر کو جانچنے اور پرکھنے کا دریچہ ہیں۔

ابتدائی مضمون میں کچھ مقبول اشعار کا حوالہ دے کر ان کے اصل متن اور مقبول عام متن میں افتراق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے اشعار کے اصل شاعر اور متن کا پتہ لگانا محققوں کا فرض بنتا ہے۔ مصنف نے ایسے محققوں کے چند نام بھی گنائے ہیں جنھوں نے اس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ دراصل اس حوالے سے سلیم سالک نے ایم فِل کی ڈگری کا مقالہ بعنوان 'اردو کے ضرب المثال اشعار' قلم بند کیا تھا۔ مضمون 'اردو کے جواں مرگ شعرا' میں مضمون نگار نے ایسے کئی نامور اردو شاعروں کا ذکر کیا ہے جن کی موت کیٹس اور رسول میر کی طرح عالم شباب میں ہوئی مثلاً محمد قلی قطب شاہ، نسیم لکھنوی، سرور جہاں آبادی، چکبست لکھنوی، اختر شیرانی، مجاز لکھنوی، میرا جی، ناصر کاظمی اور پروین شاکر۔ علاوہ ازیں مومن خان مومن، خلیل الرحمٰن اعظمی، اصغر گونڈوی اور ڈاکٹر فرید پربتی پچاس کی عمر پار کرتے ہی غریق رحمت ہو گئے۔ ایک اور مضمون میں مصنف نے اصلاحِ سخن کو اردو

شاعری کی ریڑھ کی ہڈی گردانا ہے اور استادی وشاگردی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس بارے میں ایک اہم اور دلچسپ عربی حکایت بھی درج کی ہے کہ اچھا شاعر بننے کے لیے نو وارد کو کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے مگر اس کا غلام نہیں بننا چاہیے بلکہ اپنا منفرد اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔

نثری ادب میں سلیم سالکؔ کا محبوب موضوع افسانہ رہا ہے۔'افسانہ لکھ رہا ہوں، افسانہ ہو رہا ہوں' میں افسانے کی مبادیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور واقعیت نگاری، حقیقت نگاری، رپورتاژ، علامت نگاری، تجریدیت، چٹکلہ نگاری وغیرہ میں باہم تمیز کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نئے افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ بقول کالم نویس آج کل موضوع اور متن سے انصاف نہیں ہوتا ہے اور لکھنے والوں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ ایک اور کالم میں تخلیق کاروں خصوصاً افسانہ نگاروں کے تخلیقی عمل پر مشاہیر کے خیالات کے اقتباس دیے گئے ہیں اور ان پر بحث کی گئی ہے۔ افسانے کے تشکیلی عناصر خصوصاً پلاٹ پر بھی مصنف نے 'سرسری تم جہان سے گزر گئے' میں اپنے تجربے کی روشنی میں خاصی بحث کی ہے جو ایک مبتدی کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ ترجمے کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ اس بارے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کی طرح ہی کشمیر میں ایک ادارہ قائم ہونا چاہیے۔ مگر میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ میں نے عثمانیہ کی کئی کتابیں بروڈہ سنٹرل لائبریری میں دھول کھاتی ہوئی دیکھی ہیں۔ ان کے وضع کیے ہوئے اصطلاحات خال خال ہی استعمال ہوتے ہیں۔ دراصل سرکاری اداروں کا کام ہمیشہ ہی ناگوار ہوتا ہے کیونکہ عملی ضروریات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ مختلف سبجکٹس میں کتابیں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور وہ کتابیں ملک میں لائبریریوں میں فراہم کی جائیں۔ ترجمہ نگار جو اصطلاحات صحیح سمجھیں انھیں استعمال کر لیں۔ کوشش یہ ہونی

چاہیے کہ اصطلاحات زمین سے جڑی ہوں، نہ معرب ہوں اور نہ مفرس۔

کشمیر کے نامور ادیبوں اور صحافیوں کی رحلت پر سلیم سالک اپنے ادبی کالموں میں خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں شامل جن شخصیات کو خراج عقیدت پیش کی گئی ہے ان کے نام یوں ہیں: خواجہ ثنا اللہ بٹ [ایڈیٹر روزنامہ آفتاب، سرینگر]، حکیم منظور [شاعر]، عبدالرحمن مخلص [صحافی و کالم نگار]، شمس الدین شمیم [افسانہ نگار و صحافی]، پروفیسر فرید پربتی [شاعر و ناقد]، عمر مجید [افسانہ نگار و صحافی]، بشیر شاہ [ڈرامہ نگار، افسانہ نگار و پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو]، شجاع سلطان [شاعر] اور طاہر مضطر [صحافی و شاعر]۔ خواجہ ثنا اللہ بٹ اور روزنامہ آفتاب کی ادبی خدمات پر انھوں نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بقول سالِک خواجہ ثنا اللہ بٹ، ایڈیٹر روزنامہ آفتاب یکتائے روزگار تھے اور نئے قلم کاروں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی ہمدرد شخصیت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے مصنف نے ڈاکٹر بشیر گاش کی ترتیب دی ہوئی 'ارمغان کاشمر' پر خواجہ ثنا اللہ بٹ کے حوصلہ افزا تاثرات بھی درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر فرید پربتی کالم نویس کے استاد رہے ہیں اور رباعی گوئی و انتقادیات میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے حالانکہ بقول سالک ''وہ تقریر میں ماہر نہیں تھے لیکن تحریر میں ان کے فن کا جادو بولتا تھا''۔ ان کی شخصیت اور فن پر سالک نے مختصر خاکہ رقم کیا ہے۔ فرید پربتی میرے قریبی دوست تھے اور میں ان کی انسان دوستی، خلوص اور محبت کا قائل تھا۔ سالک نے ان کے بارے میں ایک کتاب 'فرید پربتی ۔۔۔ شعر، شعور اور شعریات' بھی مرتب کی ہے۔ عمر مجید ریاست کے اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگار تھے مگر تساہلی کی وجہ سے انھوں نے اپنا افسانوی مجموعہ شائع نہیں کیا۔ نتیجتاً یہ بیڑا سلیم سالک نے ان کی وفات کے بعد اٹھایا اور 'عمر مجید کے بہترین افسانے' کے عنوان سے کتاب شائع کی۔ بدقسمتی سے عمر مجید سے میری ملاقات زندگی

کے اس سٹیج پر ہوئی جب وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھے، اس لیے ترسیل میں مشکلیں پیدا ہو رہی تھیں۔

مندرجہ بالا قلم کاروں کے علاوہ سلیم سالکؔ نے کئی مشاہیر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان میں ایسے ادبا بھی ہیں جو وادی سے تعلق نہیں رکھتے تھے تاہم وادی سے ان کی انسیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زورؔ، علی جواد زیدی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، مظہر امام، پروفیسر آل احمد سرور، کمال احمد صدیقی، زبیر رضوی، فیاض رفعت، کے کے نیّر، آفاق احمد، قدوس جاوید، اکبر جے پوری اور شبیب رضوی۔ سروریؔ اور زورؔ تو وادی کی مٹی میں ہی دفن ہیں۔ پروفیسر محی الدین قادری زورؔ ہمیشہ کشمیر سے ابھر رہے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔انھوں نے کئی نئے لکھاریوں جیسے پروفیسر مخمور حسین بدخشی، قاضی غلام محمد اور حامدی کاشمیری کی تصانیف بالترتیب 'نیل کنول مسکائے'، 'حرف شیریں' اور 'ناصر کاظمی کی شاعری' اپنے رسوخ سے ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد سے چھپوائیں۔ پروفیسر محمد دین تاثیرؔ کی شادی اور اس کے وساطت سے فیض احمد فیضؔ کی سرینگر میں ایلس سے شادی کا قصہ بھی درج کیا گیا ہے۔ اقبالؔ کا بحیثیت وکیل دورۂ کشمیر، کشمیریوں کی ان سے عقیدت، کشمیر کے ناگفتہ بہ حالات سے ان کی آشنائی اور مہاراجہ جموں وکشمیر کے ساتھ ان کی لاہور میں ملاقات کو بھی سلیم سالکؔ نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ 'نگری نگری پھرا مسافر' میں رائٹر نے کشمیری نژاد شاعر اور جدیدیت کے بنیاد گزار میراجی کی شخصیت اور فن پر سرسری نظر ڈالی ہے۔اسی طرح کشمیر سے تعلق رکھنے والے پروفیسر اکبر حیدری پر بھی بھرپور مضمون رقم کیا ہے جس میں یہ باور کیا گیا ہے کہ موصوف کو جہاں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی وہیں انھیں وادی میں وہ عزت نہیں دی گئی جس کے وہ حق دار تھے۔ تحقیق نگار اکبر حیدری اساتذۂ اردو خاص کر اقبالؔ

کے مداح تھے۔شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، سفر نامہ نگار اور تنقید نگار پدم شری پروفیسر حامدی کاشمیری کی شخصیت اور فن پر بھی مختصر تحریر ملتی ہے ۔ حامدی کاشمیری نے انتقادیات کو اکتشافی تنقید کی اصطلاح سے روشناس کرایا۔افسوس کہ موصوف حال ہی میں ہم سے بچھڑ گئے اور مجھے یقین ہے کہ اس بات کا ذکر سلیم سالک اپنے کالم میں بطورفٹ نوٹ کرنا نہیں بھولیں گے۔ایک اور مضمون میں پروفیسر محی الدین حاجنی کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔مہاجر افسانہ نگار وریندر پٹواری ، جو اپنی جسمانی معذوری کے باوجود ادب کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں، کی شخصیت اور فن پر بھی مختصر خاکہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ اردو اور پنجابی کے شہرت یافتہ افسانہ نگار خالد حسین کا خاکہ بھی رقم ہوا ہے اور ان کے افسانے پر مبنی فلم 'لکیر' پر بھی چرچا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر مخمور حسین بدخشی پر سیر حاصل مضمون کتاب میں شامل ہے۔

عام طور پر کشمیر کے ادیبوں کو اردو کے خود ساختہ محافظوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔تاہم چند مثالیں ایسی ہیں جن کو بقول کالم نویس فوری پہچان ملی مثلاً غلام رسول نازکی جن کی پہلی کاوش جوشؔ کے رسالے 'کلیم' میں چھپی اور پریم ناتھ در جن کے پہلے افسانے 'غلط فہمی' پر 'ادبی دنیا' کے مدیر صلاح الدین احمد نے بے انتہا تعریف کی۔اس پس منظر میں کالم نویس اپنے کالم 'پوچھو بہتے پانی سے' میں نئے قلم کاروں کو ہدایت دیتے ہیں کہ ابتدائی ناکامیوں سے ہمت نہیں ہارنا چاہیے بلکہ اپنی کوششیں مسلسل جاری رکھنا چاہئیں۔

فلم سے متعلق بھی ایک باب ہے جس کا عنوان ہے 'پردۂ سیمیں کے سو سال'۔ اس میں ہندی سینما کے ماضی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔۱۹۱۳ء میں 'راجہ ہریش چندر' کے عنوان سے دادا بھائی پھالکے نے پہلی فلم بنائی تھی ، پھر اردشیر ایرانی نے پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' ۱۹۳۱ء میں بنائی اور اس کے بعد پہلی رنگین فلم 'کسان کنیا' فلمائی گئی۔بقول

کالم نگاران دنوں فلم کاروں کو سماجی فرائض کا شدید احساس تھا اس لیے فلمیں اخلاقی اور درسی ہوا کرتی تھیں۔ اردو کے کئی نامور ادیب ہندی فلموں سے جڑ گئے تھے۔ اردو میں فلمیں بنتی رہیں مگر سنسر کی سارٹیفکیٹ میں سبھی پر ہندی کی مہر لگ جاتی جو اردو پر ظلم تھا۔ مضمون میں دادا بھائی اور ایرانی کا مختصر خاکہ بھی دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سلیم سالکؔ کے ادبی کالم نہ صرف تجربات کا خزانہ ہیں بلکہ نئی نسل کے لیے رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات کو پیش کر کے نئی نسل کو ہمت نہ ہارنے اور محنت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انھیں اردو سے عشق ہے اور وہ اس سمت میں اپنی ساری قوت صرف کرتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جادۂ حیات میں یہ محض ایک سنگ میل ہے، ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں ، اس لیے امید کرتا ہوں کہ سلیم سالک اپنی نگارشات سے مستقبل میں بھی اردو ادب کی آبیاری کرتے رہیں گے۔

—— دیپک بدکی

......●......

صریرِ خامہ کی جمالیات

محترم سلیم سالک کے کالموں کا مجموعہ ''صریرِ خامہ'' کا مسودہ راقم نے اوّل تا آخر غور وفکر کے ساتھ پڑھا ہے۔ کبھی میرے ذہن میں سوال اُبھرتے رہے، کبھی دل میں خوشی کی لہر دوڑی اور کبھی حیرت ہوئی۔ مختلف کیفیات کے دورانیے کے ساتھ کتاب کے اختتام کو پہنچا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سالک صاحب ایسی رواں اور نشاط آمیز ادبی نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں کہ افسانوی نثر کا دھوکہ ہونے لگے۔ یقینی طور پر میں اپنی ذہنی آسودگی اور دلی کیفیت بیان کررہا ہوں کہ ان کی نثر اس قدر شیریں، رواں اور شگفتہ ہے کہ مجھے اپنی نثر نگاری پر شرمندگی ہونے لگی۔ اسی کیفیت میں راقم نے تمام مجموعے کا ایک ایک حرف آخر تک پڑھ لیا۔ مطالعے کے سفر میں گونا گوں پُر لطف کیفیات سے محظوظ ہوتا رہا۔ موصوف کے مضامین کئی لحاظ سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ اوّل تو ان کی نثر رواں، شیریں، دل کش اور نشاط آمیز ہے۔ دوم ان مضامین میں اُنہوں نے نہایت عرق ریزی اور دیدۂ سوزی کے ساتھ نادر معلومات فراہم کی ہے۔ سوم کالم نویسی کے ضمن میں ان کی اپنی سوانح سمٹ آئی ہے یعنی خود نوشت کے عناصر موجود ہیں۔ جن سے ان کی پسند، ناپسند، ذوق وشوق، حرماںنصیبی، حر کی آرزوئیں اور مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی کوشش شامل ہے۔ اس طرح

ایک زمینی اور غیر معصوم انسانی کیفیات کی کشمکش کا زیر و بم ہیجانی عناصر کے ساتھ ہر ایک کالم میں اپنی موجودگی کا شدّت سے احساس دلاتا ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے ہر فرد کے لئے حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ چہارم سلیم سالک کی شخصیت سازی کے راز سے یہ پردہ بھی اُٹھتا ہے کہ بزرگ اور کہنہ مشق شعرا اور ادباء کے ساتھ ان کی نہ صرف دلی وابستگی رہی ہے بلکہ ان کا احترام بھی ان کے دل میں حسب مراتب موجود رہا ہے، جس کے سبب اپنے پیش رو ادیبوں اور شاعروں سے کسبِ فیض میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کا رنگ اُن کی تحریروں کے حرف حرف میں نظر آتا ہے۔ پنجم یہ کہ ان کے کالموں میں خاکہ نگاری کا لطف بھی محسوس ہوتا ہے۔ وہ جب کسی ادیب یا شاعر کی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ اُس شخصیت کو ہم اپنی چشمِ تصور سے دیکھ رہے ہیں۔ جس ادبی محفل کا ذکر چھیڑتے ہیں تو وہاں کی زعفرانی مجلس کی آوازیں قوتِ سماعت سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مستقبل میں ادبا اور شعرا شناسی کے لئے محققین اور ناقدین کو ان کالموں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جن میں بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کے سنجیدہ، بالیدہ، بے تکلف اور شاعرانہ بذلہ سنجی کے مرقعے اپنی مختلف کیفیات اور حرکات کے ساتھ سمٹ آئے ہیں۔ جن کو کرید کرید کر سلیم سالک نے ان کی اندرونی دنیا کے خول سے باہر لایا ہے۔ ششم تحقیقی وتنقیدی شعور بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہفتم ان کے بعض کالموں میں رپورتاژ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہشتم ادبی تاریخ کے بعض عناصر بھی اپنی اور دعوت فکر دیتے ہیں۔ مذکورہ خصوصیات میں سے بعض کو درج ذیل اقتباسات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

محفل کا منظر اور اُس کی آوازوں کا احساس:

"خدا جانے شمس الدین شمیم کے دل میں کیا سوجھی وہ فوراً اٹھے اور سب کو کھانے کی طرف متوجہ کیا کہ پہلے کھانا، پھر رونا۔ کھانے کے

خاص انتظام رکھا گیا تھا، جس میں وازوان کے سارے پکوان موجود تھے، جیسے سچ مچ شمیم دلہا تھا اور ہم سب باراتی۔ کھانے کے بعد پھر محفل جمی تو شمیم صاحب پھر باہر کی طرف دوڑتے دکھائی دیئے، لیکن اکیلئے نہیں لوٹے بلکہ ساتھ میں ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔ اس کو حسنِ اتفاق ہی سمجھئے یا شمیم کی بزلہ سنجی کہ فوٹو گرافر بھی ایک نیم شاعر نکلا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ چند شعرا ایک جگہ جمع ہوں اور وہ اپنے کلام کے دفتر کھولنے کی کوشش نہ کریں۔ بس پھر کیا تھا کہ شہیدی صاحب نے بغل میں چھپائی ہوئی بیاض نکالی اور اپنے مخصوص انداز میں اشعار گنگنانے لگے بقول جاوید آذر شہیدی صاحب ''خ'' کو اپنے مخرج سے ادا کرتے ہیں تو شعر کھنکھناتے ہیں۔''

خاکہ اور ناول یا افسانہ کی واحد متکلم کی تکنیک میں قصہ گوئی کا لطف و جمال ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے فرید صاحب کے کمرے کی راہ لی، ابھی دروازے کا پردہ تھوڑا کھسکایا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کمرے میں دو صاحبان بیٹھے تھے۔ ایک اپنا کلام سنا رہا تھا تو دوسرا ہمہ تن گوش آنکھیں بند کئے کلام سن رہا تھا، کلام سنانے والا دور سے ہی شاعر لگ رہا تھا، اس کے گیسو دراز اور لباس شاعرانہ تھا لیکن سننے والا چوڑا بدن، خوبرو، دراز قد، بارعب، کلین شیو اور سوٹ بوٹ والا کسی بھی طور شاعر نہیں لگ رہا تھا۔ میں مخمصے میں پڑ گیا فرید صاحب کون ہو سکتے ہیں کیوں کہ دونوں کھڑکی سے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور فرید صاحب کی گھومنے والی کرسی (Moveable Chair) خالی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اجازت طلب کی تو سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص نے ہاتھ کے

اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔‘‘

سلیم سالک کے قریب قریب بیشتر کالموں میں رپورتاژ کے عناصر در آئے ہیں لیکن ’’سرحدیں روک نہ پائیں گی کبھی رشتوں کو‘‘ کالم میں رپورتاژ کے عناصر کا جمال اپنی اور کھینچتا ہی چلا جاتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

’جھلسا دینے والی دھوپ کے تھپیڑے، دوپہر کا وقت اور رگھوناتھ بازار کی دھکم پیل ۔ ہر طرف گہما گہمی کا عالم ، لوگ ایک دوسرے سے بے خبر اپنے کام میں مصروف ۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ’’ہری تھیٹر‘‘ کارخ کیا جہاں اچھی خاصی چہل پہل دیکھنے کو ملی ۔غیر متوقع چہل پہل نے میری حیرت میں اضافہ کیا کیوں کہ ہری بھیٹر کی خستہ حالی کا مشاہدہ میں نے پہلے بھی کیا تھا۔اس لئے لوگوں کا رش سمجھ سے بالاتر تھا۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی پہاڑی فلم چل رہی ہے۔ میں نے بے دلی محسوس کرتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹنے میں عافیت سمجھی ۔ شاید اس لئے کہ پہاڑی فلم میری دلچسپی سے میل نہیں کھاتی ۔ چند ساعت ٹھہر جانے کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اتنے سارے لوگ فلم دیکھنے جمع ہوئے ہیں شاید کوئی خاص بات تو ہوگی ...... فلم شروع ہو چکی تھی اور اندھیرا اتنا کہ ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ بڑی مشکل سے ایک سیٹ ملی جو اتنی سخت تھی کہ پہلو بدلنے میں بھی دقت ہوتی فلم کے دل نشین مناظر سے صاف پتا چلتا تھا کہ راجوری اور پونچھ کے پہاڑی سلسلوں کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔‘‘ ......

لیکن اتنی پر جمال نثر، نادر معلومات، کم یاب شخصیات کی روبرو گفتگو اور اُن کے جزوی خاکے کے حامل کالم کے باوجود سالک صاحب کی بعض تحریروں میں کہیں کہیں

تاثراتی پیراگراف یا جملے تنقیدی شعور پر ضرب لگانے لگتے ہیں۔ اگر ایسے مقامات پر تنقیدی بصیرت کی کارفرمائی رونما ہوتی تو یقیناً اس کتاب کا تنقیدی معیار کچھ سوا ہو جاتا۔ ان کے تاثراتی اسلوب کا ایک نمونہ ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

''بس پھر کیا تھا میں نے حکیم منظور کی شاعری کو سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے مقامی شعراپڑھنے کی تحریک ملی۔ طویل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حکیم منظور کئی طرح سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک بڑے شاعر میں جو خصوصیات ہونی چاہیئے وہ سب حکیم صاحب کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔''

خیر کالم نویسی سے اتنی امیدیں باندھنا بھی غیر مناسب ہے۔ کیوں کہ کالم نویس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تنقیدی بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کر سکے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کسی کے کلام پر تبصرہ یا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیئے کہ وہ مفروضہ جو اُس نے قائم کیا ہے یا وہ دعویٰ جو اس نے پیش کیا ہے۔ کیا وہ اُسے اس کے کلام سے معروضاتی مواد و اسلوب کے ساتھ ثابت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کے پاس دلیلیں ہیں تو وہ اپنے مضمون یا تحریر میں پیش کرے۔ کیوں کہ تنقیدی بصیرت رکھنے والے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تنقید کو سائنٹیفک طریقے سے بروئے کار لائے۔ تاکہ فن پارے اور فن کار کا ادبی مقام واضح ہو سکے۔ اگر اُس کے پاس دلائل نہیں ہیں تو بنا دلیل دعویٰ اعتبار کھو جاتا ہے۔ کسی دوسرے لکھنے والے نے اُس کے بارے میں کیا کہا یا لکھا ہے یہ اُس کے دلائل پر منحصر ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاح نے اُس کے بارے میں یہ لکھا ہے۔ تحقیقی یا تنقیدی اعتبار سے ایک باشعور اور صاحب بصیرت قاری کے لئے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تنقیدی اور تحقیقی

اصولوں کے مطابق نتیجے اخذ کرنا ہی دراصل فن کار کے لئے صحیح خراج عقیدت ہے۔ کیوں کہ کوئی کہنے والا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر بھی کچھ کہہ سکتا ہے۔ صحیح تنقیدی جائزہ، تبصرہ یا تجزیہ وہ کہلاتا ہے جو دلیلوں کے ساتھ اعتدال پر مبنی ہو۔

لیکن فی زمانہ عام طور پر جو کالم لکھے جاتے ہیں، ان سے بڑی حد تک سلیم سالک کے کالم معیاری ہیں۔ ان کی کالم نویسی میں جو دیگر اصنافِ ادب کے عناصر شامل ہیں وہ ''صریر خامہ'' کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ چوں کہ سالک صاحب نے جس محنت سے ادیبوں اور شاعروں کے افسانوں، شعری مجموعوں اور بیاضوں کو ان کے تہ خانوں اور لائبریروں کے بھولے بسرے خانوں سے تلاش کیا ہے یقیناً یہ کام عرق ریزی کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی اس محنت شاقہ سے بہت ساری نادر معلومات ان کے کالموں میں سمٹ آئی ہے۔ ذاتی طور پر میں ''صریرِ خامہ'' کے مشمولات سے مستفیض ہوا ہوں۔ سلیم سالک کی کشادہ ظرفی، ادبی دیانت اور تحقیقی وتنقیدی ایمان داری کا یہ جمال ہے کہ انہوں نے ریاست اور بیرون ریاست سے وارد ہونے والے نمائندہ ادیبوں میں سے قریب قریب سب کی ادبی کاوشوں اور قربانیوں کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کے مراتب کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے۔ شیریں اور تلخ ہر بات شگفتہ و سنجیدہ اسلوب اور لہجے کے جمال کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ادیب کو ادب تحریر کرنا بلاشبہ زیب دیتا ہے۔

سلیم سالک نے زیادہ تر کالموں میں اپنے شاعر بننے کی کوششوں کو مایوسانہ کیفیات کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ میں شاعر نہ بن سکا۔ لیکن میرے خیال میں بہت سارے متشاعروں کو شاعری ترک کر کے سلیم سالک سے ادبی نثر تحریر کرنے کی مشق لینی چاہیئے۔ مجھے یہاں پر حسرت موہانی کا وہ شعر یاد آتا ہے جو انہوں نے ابوالکلام آزاد کے نثری جمال سے متاثر ہو کر کہا تھا:

؎ جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''صریر خامہ'' میں معلوماتی، نظریاتی، سوانحی، افسانوی، خاکہ نگاری، تنقیدی، تحقیقی اور رپورتاژی جمال سمٹنے کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب کی شگفتہ بیانی اور تلخ و شیریں لہجات کی جمالیات نکھر آئی ہے۔ یہ انفرادیت اس کتاب کو زندہ رکھنے کی ضامن ہوسکتی ہے۔ مجھے اُمید ہے ادبی حلقوں میں ضرور اس کی پذیرائی ہوگی اور یہ منفرد تصنیف نو وارد نثر نگاروں کے لئے ایسی تحریریں پیش کرنے میں محرک ہوگی۔

—ڈاکٹر ملک محمد آصف

......●......

ناسٹیلجیا کا مسافر

سلیم سالکؔ کے ساتھ میری شناسائی بہت پرانی تو نہیں، البتہ کچھ بے تکلفانہ سی ضرور ہے۔ سچ کہیے تو خدا کے اس بندے نے فطرت ہی کچھ ایسی پائی ہے کہ جس سے بھی اس کا تعلق ہے، بے تکلفانہ ہے۔ سلیم دراصل پرانے وقتوں کے سے لگاؤ، خلوص اور انسیت کا مرقع ہے جو کسی آرکائیو کے طاقچے سے پھسل کر ہمارے درمیان آنکلا ہے۔ اس کے سیدھے سادے اور صاف شفاف سوبھاؤ کو تکلفانہ پیچیدگیوں اور منافقانہ لگی لپٹیوں سے کوئی غرض نہیں۔ ہاں خلاق اعظم نے اس کی طبیعت میں ظرافت و بذلہ سنجی کا محلول خوب گھول، بلکہ انڈیل رکھا ہے۔ غالباً اسی کیمیائی مرکب کے جادو سے وہ انجانوں اور بیگانوں کو اپنی دوستی کے قلعے میں محصور کرتا جاتا ہے۔ برجستہ کالموں کا یہ مجموعہ کھلے ڈلے سلیم سالک کی خوبی کی غمازی کرتا ہے۔ اخلاص اور اعتماد کی رو میں جب وہ اپنی بات کہتا چلا جاتا ہے تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا کہ زبان کہیں اوبڑ کھابڑ میں پڑ رہی ہے یا بیان کسی بناؤ سنگھار کا ملتجی ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں جھومتا جھولتا بس چلا جاتا ہے، بے تکلف اور بے روک ٹوک۔ کبھی ہلکے پھلکے لہجے میں بڑی بڑی ادبی گتھیاں سلجھا دیتا ہے تو کبھی سنجیدگی اوڑھے اچانک ظرافتیں بکھیرنے لگتا ہے۔ کہیں اچانک کسی سربستہ راز سے پردہ اٹھا دیتا ہے

اور کہیں بھینچے بھینچے لبوں سے کوئی طنزیہ تیر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کا روزمرہ کا طرز تکلم بھی ہے۔

ریاست میں اردو صحافت اور کالم نگاری کی زندہ اور توانا روایت ماضی سے چلی آ رہی ہے۔ شمیم احمد شمیم، ثناء اللہ بٹ، عبدالرحمن مخلص، نور شاہ، حسن زینہ گیری، کرشن دیو سیٹھی اور کئی دوسرے کالم نویس ماضی قریب یا حال تک مسلسل چھپتے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے ہیں۔ کچھ سال پہلے ایاز رسول نازکی نے روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں اپنے کالموں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو خالص ادبی نہ ہونے کے باوجود اپنی زبان و بیان کی وجہ سے ادبی اور علمی حلقوں کافی پسند کیا گیا۔ خود سلیم سالک نے بھی مذکورہ روزنامہ میں ایک عرصے تک کالم نویسی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور جو بالآخر ''کتاب دریچہ'' کی صورت میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ اب سلیم سالک کا کالموں کا دوسرا مجموعہ ''صریر خامہ'' کے عنوان سے شائع ہونے جا رہا ہے۔ ''صریر خامہ'' میں شامل تمام کالم کشمیر عظمیٰ کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن کی زینت بن چکے ہیں۔

باقی خصوصیات سے قطع نظر، جو چیز ان کالموں کو دوسرے کالموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا خالصتاً ادبی ہونا ہے۔ اگرچہ ریاست کے کئی کالم نویسوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن میری جانکاری کے مطابق ادبی کالموں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے (پہلا بھی سلیم سالک کا ہی ''کتاب دریچہ'' ہے) جس میں شامل تمام تحریریں ادبی نوعیت کی ہیں۔

کالم نویسی اصلاً صحافتی اصطلاح ہے اور صحافتی تحریروں کی اہمیت عموماً وقتی ہوتی ہے۔ سیاسی اور سماجی نوعیت کے کالم عصری لب و لہجے اور وقتی مسائل و متعلقات پر مشتمل ہوتے ہیں اور وقت اور حالات کا پہیہ گھومتے ہی یہ کالم باسی ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ تحریریں کالم کے سانچے، لبادے سے باہر جھانتی بلکہ بھاگتی

ہوئی معلوم پڑتی ہیں۔ یہ تحریریں دراصل سلیم سالک کی مقدور بھر تحقیقی کاوشوں پر مشتمل تحقیق پارے ہیں جو موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے کئی اعتبار سے دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ سلیم سالک اگر ان ادبی اور تحقیقی عرق ریزیوں کو کتابی شکل میں نہ لاتے تو خود اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے اور اردو زبان وادب پر بھی۔

گھمبیر قسم کے تحقیقی، تنقیدی مقالوں یا اعلیٰ طنزیہ مزاحیہ خاکوں کی بات اور ہوتی ہے لیکن ہلکے پھلکے کالم، چاہئے ادبی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں، جب وقفے وقفے سے اخباروں، روزناموں میں پڑھنے کو ملتے ہیں تو دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں لیکن جب ایک ساتھ کتابی شکل میں سامنے ہوتے ہیں تو طبیعت دو چار صفحوں کے بعد ہی اوبنے لگتی ہے۔ زبان و بیان کی یک رنگی اور موضوعاتی تکرار و تسلسل قاری کو بور کر دیتی ہے۔ کالموں کے اس مجموعے میں، البتہ موضوعاتی سطح پر بھانت بھانت کی باتیں چھیڑ کر سلیم سالک نے یک رنگی کی بجائے صورت حال کو رنگارنگ کینواس میں بکھیر دیا ہے۔ جس سے قاری بوریت کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔ بے تکلفانہ انداز گفتگو سے تحریر میں تر و تازگی کا سامان آگیا ہے۔ ساری کی ساری کتاب میں ایک ایسا شخص بولتا معلوم پڑتا ہے جو چٹخارے لے لے کر گزرے دنوں اپنے ساتھ بیتے واقعات سنا رہا ہو اور اس آپ بیتی طرز کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بڑی بڑی مفید اور گنجلک باتیں بھی آتی چلی جاتی ہیں لیکن بلا کسی گھمبیرتا کے۔ گویا میٹھے مربے میں کڑوی دوائی کب نگل لی پتہ نہیں چلتا۔ ظرافت وبذلہ سنجی اور طنز و مزاح کی خفیف سی پرت قاری کو ایسے باندھے رکھنے کا کام کرتی ہے کہ وہ مسکراتا تو جاتا ہے لیکن کھل کر ہنسنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیتا کہ اتنی دل چسپ بات کی گرہ کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

ایک اور خاصیت جو اس کتاب میں شامل تمام تحریروں میں سیالِ مشترک کی

طرح رواں ہے وہ ان کا ناسٹیلجیائی لہجہ ہے۔ ہر بات یا تو شروع ہی کسی بیتی یاد، گزرے واقعہ، یا سنے سنائے قصے سے ہورہی ہے یا ادھر ادھر گھوم گھام کر اس کے گرد مجتمع ہورہی ہے۔ بظاہر ہلکے پھلکے کالموں پر مشتمل یہ کتاب طفنن طبع کا سامان ہی نہیں بلکہ سلیم سالک کی تحقیقی کاوشوں اور ادبی عرق ریزی سے عبارت نہایت اہم اور معلوماتی دستاویز ہے۔

—جنید جاذبؔ



دل کی بات

کالم نویسی کا فن عہد حاضر میں کافی وسعت پا چکا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر نوع بہ نوع کالم لکھے جاتے ہیں۔ زندگی سے جڑے ہر معاملے کو کالموں کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کالم نگار موضوعات کی سرحدیں پھلانگنے میں قطعی عار محسوس نہیں کرتا تھا لیکن آج اسے اپنے مخصوص و محدود دائرے میں رہتے ہوئے ہی زمین و آسمان کے قلابے ملانے پڑتے ہیں۔ مصاحبت اور مخاصمت کی پرچھائیوں سے بچ کر غیر جانب داری کا دامن تھامے رہنا کالم نویس کے لئے بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ ہفتہ وار کالم لکھنے کے لئے بقول افلاطون ''کتھارسس'' سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں کسی موضوع کو concieve کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ گلوبل دنیا کو تسخیر کرنے والا قاری گھر بیٹھے ساری معلومات حاصل کرتا ہے۔ ایسی صورتحال سے دوچار لکھنے والا سوچ میں غلطاں ہے کہ کس نہج پر اپنے کالم کی بنت کاری کرے کہ قاری کو بھی رجھائے اور بے سر پیر کی ہانکنے سے بچ جائے۔

اردو زبان کی زلف گرہ گیر کو سنوارنے میں کالم نویسی کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ یہاں تک دیگر اصناف سخن سے بغاوت کر کے سیاست و سماجیات، معاشیات و اقتصادیات اور ادبیات کے فلک رنگ موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر قارئین کی دلچسپی کا وافر سامان بہم کیا ہے ۔اردو کے جن ادیبوں نے کالم نویسی میں زور

آزمائی کر کے یادگار کالم لکھے ان میں ابوالکلام آزاد ''افکار حوادث''، عبدالمجید سالک ''فکایات''، عبدالماجد دریا آبادی ''سچی باتیں''، فکر تونسوی ''پیاز کے چھلکے''، احمد ندیم قاسمی ''حرف وحکایات''، ابرہیم جلیس ''وغیرہ وغیرہ''، احمد جمال پاشا ''گلوریاں''، مجتبیٰ حسین ''میرا کالم''، ظفر اقبال ''دال دلیا'' وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔

ریاست میں بھی کالم نویسی کی مختصر تاریخ موجود ہے۔ایک زمانے میں دیوان سنگھ مفتون، چراغ حسن حسرت، شمیم احمد شمیم اور عبدالرحمان مخلص کے کالموں کی بازگشت دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ ماضی قریب سے لیکر تا حال کئی کالم نویس اپنی فکری صلاحیتوں سے کالموں کی دھار صیقل کر رہے ہیں۔ان میں کرشن دیو سیٹھی، حسن زینہ گیری، ڈاکٹر جاوید اقبال، راجہ نذر بونیاری، ،نور شاہ، ایاز رسول نازکی، نذیر مشتاق، نذیر جہانگیر اور شہزادہ بسمل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میرے کالم نویس بننے کے محرکات خاص نہیں بلکہ میں نے لاکھ چاہا کہ افسانہ لکھوں لیکن خود کو افسانے لکھنے کے لئے آمادہ نہیں کر پایا۔پھر شاعری کی طرف مراجعت کی وہاں بھی منہ کی کھانا پڑی۔ مقالہ لکھنے میں تصنع اور بناوٹ کے اصولوں سے طبیعت اوب گئی۔ پھر کالم نویسی شروع کی جس میں کسی حد تک اپنے آپ کو مطمئن کر پایا۔کالم نویسی میں مستقل مزاجی اور موضوع کی مناسبت دونوں لازم وملزوم ہے۔ پھر اگر کہیں سے شاباشی کے دو بول کانوں میں پڑ گئے تو سُر خواب کے پر لگنے میں دیر نہیں لگتی ۔شاید میرے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا۔ کچھ عرصہ سے کالم لکھ رہا ہوں۔ 2009 میں ''کتاب دریچہ'' کے عنوان سے کالموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

میرے کالم ''صریر خامہ'' کی آسانی یہ تھی کہ مجھے زیادہ مواد ''مطالعہ و مشاہدہ'' میں ہی مل جاتا تھا۔لیکن دانستہ طور پر کالم کی تمہید باندھتے وقت ذاتی واقعات

کا بڑا اسہار الیا جس سے کچھ تلخ یا خوشگوار یادیں بھی محفوظ ہو گئیں۔ کبھی کبھار کسی ادیب یا شاعر کی موت بھی کالم لکھنے کا محرک بنا۔ مجھے اس بات کا قطعی زعم نہیں کہ میرے کالم تحقیقی یا تنقیدی نوعیت کے ہے بلکہ میں ان کو تاثراتی ہی تصور کرتا ہوں۔

میں محمد یوسف ٹینگ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پورا مسودہ پڑھ کر اپنے حوصلہ افزا کلمات سے نوازا، ساتھ ہی کچھ اہم facts کی طرف بھی نشاندہی کی۔ جناب فاروق نازکی صاحب کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ عدیم الفرصت ہونے کے باوجود میرے لئے کچھ سطریں تحریر کیں، جن سے میرے حوصلوں کو جلا ملی۔ جناب دیپک بدکی صاحب کا بہت ہی ممنون ہوں کہ انہوں نے مسودہ کی ایک ایک سطر کا مطالعہ کر کے اپنے ذریں تاثرات سے نوازا۔ ڈاکٹر آصف علیمی کا شکریہ واجب ہے، انہوں نے پورے مسودے کا عرق ریزی سے پروف ہی نہیں پڑھا بلکہ ایک مضمون بھی سپرد قلم کیا۔ برادرم جنید جاذب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے "صریر خامہ" کے حوالے سے اپنے مخصوص انداز میں تاثرات رقم کئے۔ میرے یہ کالم "کشمیر عظمیٰ" کی زینت نہ بن پاتے اگر استاذی جاوید آذر صاحب نظر التفات سے نہ نوازتے۔ برادرم شاہ طارق کا شکریہ واجب ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے کتاب کا سرورق بنایا۔ ایف آئی فیضی صاحب کی کوششوں سے ہی "صریر خامہ" کا مسودہ زیور طباعت کے خوشگوار مرحلہ سے گزر کر کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ اس لئے ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں اپنی شریک حیات کو یہ کریڈیٹ دینا چاہوں گا، جس نے مجھے ان کالموں کو کتابی شکل دینے کے لئے اکسایا، ورنہ ان کالموں کا میری تساہل پسندی کی وجہ سے ضائع ہونا یقینی تھا۔ آخر پر "کشمیر عظمیٰ" کے قارئین کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے ہر اتوار "صریر خامہ" کو پڑھا اور ساتھ ہی اپنے حوصلہ افزا تاثرات سے بھی نوازا۔

—— محمد سلیم سالک

وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

سردی کی شدّت زوروں پر تھی ،جنوری کا پہلا عشرہ تھا، چلہ کلاں نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔بجلی کی آنکھ مچولی شباب پر تھی اور قریباً ۱۰ بجے رات کو لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی، بادلِ ناخواستہ گرم لحاف چھوڑ کر جب میں نے فون کا رسیور اُٹھایا، بھاری بھر کم آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز کشمیر عظمیٰ کے مدیر جاوید آذر کی ہے۔سلام ودعا کے بعد کہا برخوردار! سوئے تو نہیں تھے۔نہیں تو، اپنے سفید جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے میں نے فوراً ایک خوبصورت بہانہ تلاشا اور برجستہ کہا کہ ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوا ہوں۔آپ حکم کیجئے۔ مزید کچھ کہے بغیر انہوں نے ایک شعر پڑھا:

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

میں حیران و پریشان، شعر کا معمّہ سمجھنے سے قاصر ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا رہا، لیکن چند لمحوں میں ہی گتھی سلجھ گئی جب آذر صاحب نے کہا کہ اس شعر کے خالق کا کچھ اتہ پتہ ہے۔میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔تو انہوں نے مجھے یہ کام سونپا کہ میں کہیں سے اس شعر کے خالق کا پتہ لگاؤں۔میں نے حامی بھر لی اور اگلی صبح یونیورسٹی کی راہ لی۔

بسیار تلاش کے بعد بھی شعر کے خالق کا پتہ نہ چل سکا۔ جب شعبے کے اساتذہ سے دریافت کیا، تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پورا دن اسی شعر کی نذر ہو گیا، تبھی میں نے اپنی مشکل کا تذکرہ اپنے دیرینہ دوست نوجوان شاعر سلیم ساغؔر سے کیا۔ انہوں نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ اس شعر کی بابت میں نے ''اُردو کے ادبی معرکے'' میں پڑھا ہے۔ بس پھر کیا تھا، میں گھر گیا اور ڈاکٹر عامر یعقوب کی کتاب ''اُردو کے ادبی معرکے'' کے اوراق کھنگالنے لگا۔ جلد دوئم میں اس شعر کا پسِ منظر اور خالق کا تفصیلی ذکر ملا۔ جو کچھ اس طرح ہے۔

اُردو کے کلاسیکل اساتذہ شعراء میں انشاء اللہ خاں انشاؔء کا شمار سرفہرست کیا جاتا ہے، انہوں نے پوری ایک کتاب ''بے نقطہ'' لکھی ہے۔ اپنی سخن دانی اور شعر فہمی پر بڑا عبور تھا، یہاں تک کہ پوری اردو تاریخ میں یہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے پوری زندگی معرکہ آرائی میں صرف کر دی۔ غلام ہمدانی مصحفؔی، فائقؔ دہلوی، مرزا محمد حسین قتیؔل اور عظیم بیگ دہلوی وغیرہ جیسے کہنہ مشق شعراء ہمیشہ ان کے حدف تنقید رہے۔

انشاؔء اور عظیؔم کا معرکہ بہت ہی مشہور ہے کہ ایک دن مرزا عظیؔم بیگ دہلوی بحرِ رجز میں ایک غزل لکھ رہے تھے، چونکہ ان کی زیادہ توجہ مضمون و معانی پر مرکوز تھی، اس لئے مذکورہ بحر کا زیادہ خیال نہ رہا اور کچھ شعر بحرِ رمل میں موزوں ہو گئے۔ جب غزل مکمل ہو گئی تو انہوں نے اپنے دوستوں کو بڑے فخر کے ساتھ سنائی۔ اتفاق سے اس وقت انشاء اللہ انشاء وہیں موجود تھے۔ انہوں نے اس فرق کو محسوس کر لیا اور حریفانہ انداز میں خوب بڑھ چڑھ کر داد دی اور غزل کو مکرّر پڑھوایا۔ یہ تمام اشعار ان کے ذہن نشین بھی ہو گئے۔ جب مرزا عظیؔم نے مشاعرہ میں آ کر یہ غزل پڑھی تو انشاؔء نے ان سے تقطیع کی فرمائش کی۔ مرزا عظیؔم کو وہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کو اعتراف کرنا پڑا۔ مشاعرۂ عام میں عظیؔم جیسے خود پسند شاعر کے لئے یہ سبکی کچھ کم نہ تھی

اور ادھر انشاءؔ نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس موقع کے لئے ایک مخمس بھی لکھ کر لائے تھے۔ جو بھرے مشاعرے میں عظیم کو مخاطب کر کے پڑھا۔

جو تو مشاعرے کو صبا آجکل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا تو سنبھل چلے
اتنا نہ اپنے شعر پہ کرتا وہ بل چلے
کل ہی تو یار پڑھنے غزل در غزل چلے
بحرِ رجز کو چھوڑتے بحرِ رمل چلے

مرزا عظیم بیگ دہلوی نے گھر جا کر اپنے دل کا غبار نکالا اور انشاءؔ کے خلاف مخمس کے بارہ بند لکھے اور جس بند میں ایک شعر ضرب المثل کا درجہ پا گیا، وہ بند یوں ہے:

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیل بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق
"شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے"

اس سے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ مذکورہ شعر کا جو متن زبان زد خاص و عام ہے وہ اصل متن نہیں بلکہ مندرجہ بالا متن صحیح ہے۔ اس شعر سے مجھے ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کی تحریک ملی۔ ایسے سینکڑوں اشعار ہیں، جن کے خالقین کا صحیح پتہ نہیں ہے اور وہ اشعار دوسروں کے نام منسوب ہیں۔ میں نے ایم۔فل کے لئے ایسے ہی ایک موضوع کا انتخاب کیا، جس کے تحت مجھے ضرب المثل اشعار جمع کرنے کا موقعہ ملا۔ پہلے پہل موضوع کی نسبت سے کچھ اشعار ملے لیکن جب تدوینِ متن کا مسئلہ سامنے آیا، تو موضوع کی پیچیدگی کا احساس ہوا۔ کیونکہ کبھی کبھار ایک شعر کے کئی متن ملتے ہیں اور یہ

طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ صحیح متن کسے قرار دیا جائے۔ آخر پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اردو میں ضرب المثل اشعار کا وافر خزانہ موجود ہے، جس میں اکثر و بیشتر زبان زد اشعار اور آوارہ گرد اشعار خلط ملط ہونے کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ضرب المثل شعر کسے کہا جائے۔ ساتھ ہی اصل خالق کی نشاندہی کرنا بھی کار دارد ہو جاتا ہے کہ اصل شعر کا خالق کون ہے، کیونکہ اشعار کے غلط انتساب کی وجہ سے طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور زبان زد متن اور اصل متن میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس کے سبب اشکال پیدا ہونا فطری ہے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر سنجیدہ کام کیا ہے ان میں قاضی عبدالودود، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر عطاالرحمٰن کاکوروی، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ڈاکٹر شمس بدایونی، کالی داس گپتا رضاؔ، عبداللہ خاورؔ، خلیق الزماں خلیقؔ اور ڈاکٹر الف انصاری وغیرہ قابل ذکر محققین ہیں لیکن میں ڈاکٹر عامر یعقوب کی کتاب ''اردو کے ادبی معرکے'' سے کلی طور پر متفق نہیں ہو سکا، کیوں کہ اس بند کے آخری مصرع ''وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے'' میں لفظ ''گا'' میں کچھ جھول سی پیدا ہو رہی ہے اور شعر کا وزن متاثر ہو رہا ہے، لہٰذا میری تلاش جاری رہے گی جب تک میں اصل متن تک نہیں پہنچ پاتا۔

......●......

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

ہفت روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' کو روز نامہ بنانے کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں اور ہفت روزہ کا خاص شمارہ بابائے صحافت خواجہ ثناء اللہ بٹ کے نام موسوم کیا گیا تھا اور مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں خواجہ صاحب کی ادارت میں روزنامہ آفتاب کی ادبی خدمات پر ایک مضمون تحریر کروں جس کے لئے مجھے کئی بار محکمہ اطلاعات کے کتب خانے کی گرد جھاڑنا پڑی۔ایک ماہ کی تگ ودو کے بعد ایک طویل مضمون تیار ہوا، جو میری زندگی کا پہلا بھرپور ادبی مضمون تھا۔جس کے شائع ہونے پر مجھے ایک عجیب قسم کی سرشاری ہوئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ مضمون ایک ادبی کنٹروسی کی ابتداء ثابت ہوگا۔

20 ستمبر 2006ء، رات نو بجے موبائل کے سکرین پر معروف اردو افسانہ نگار عمر مجید کا نمبر عیاں ہوا۔میں نے فرحت بخش انداز میں ہیلو کہا تو دوسری طرف عمر مجید کا قہقہہ صاف طور پر سنائی دے رہا تھا۔میں شش وپنج میں مبتلا سوچ رہا تھا کہ آج مجید صاحب خیر وعافیت پوچھنے کی بجائے قہقہہ مار کر کیوں ہنس رہے ہیں۔ کچھ دیر توقف کر کے وہ گویا ہوئے، برخوردار کیا تم نے اس ہفتہ کا ''احتساب'' پڑھا۔میں نے نفی میں جواب دیا۔کیا تم کو پتہ ہے کہ تمہارے پرخچے اڑائے گئے ہیں؟۔کل

''احتساب'' کا تازہ پرچہ ضرور پڑھنا۔ یہ کہہ کر عمر مجید صاحب نے فون کاٹ دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میری پوری رات تذبذب اور بے چینی میں کٹ گئی۔ طرح طرح کے خدشات ابھرنا قدرتی بات تھی۔ جوں توں کر کے رات کٹ گئی تو صبح دم میں نے لال چوک جا کر کئی نیوز سٹالوں کو کھنگالنے کے بعد مذکورہ شمارہ حاصل کیا۔ اخبار پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ تو صفحہ نمبر ۳ پر ایڈیٹوریل کے ساتھ ہی ایک سرخی پر نظر پڑی جو کچھ اس طرح تھی۔ ''سلیم سالک کے نام... آفتاب کے پچاس سال اور ایک ادیب کی حق تلفی''۔ کالم نویس نے پورا کالم میرے نام کر کے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ پہلے ایک دو اقتباسات میں کشمیر عظمیٰ کا خاص شمارہ ''نصف صدی کا گواہ'' کے حوالے سے کچھ حوصلہ افزا کلمات ہی ملے۔ میرے ذہن میں عمر مجید کا یہ فقرہ گونج رہا تھا کہ ''سلیم سالک تمہارے پرخچے اڑائے گئے ہیں!!''۔ اس لئے میں جلدی جلدی اپنے بارے میں پڑھنا چاہتا تھا، جو کچھ اس طرح تھا۔

> ''مذکورہ نمبر میں سلیم سالک نے ''آفتاب کی ادبی خدمات... ایک سرسری جائزہ'' میں موضوع کا حق ادا کر دیا ہے لیکن حسبِ دستور اور روایتِ قدیم انہوں نے جہاں کم سے کم 72 ادباء و شعراء کو اپنی دانست میں خوش کر دیا ہے وہاں میری دانست میں مجھے نظر انداز کر کے میری حق تلفی کی ہے کیونکہ اگر اس ادیب اور شاعر کو بھی جائزے میں شامل کیا جائے جس کی کوئی خاص ادبی ساکھ نہ ہو تو اس ادیب کو نظر انداز کیوں کیا جائے جس کے خاکے، مضامین اور افسانے ''آفتاب'' میں خواجہ صاحب کے تعریفی نوٹس اور السٹریشن کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہوں اور جو فی الوقت کم سے کم سات کتابوں اور پندرہ سو سے زائد افسانوں، مضامین، خاکوں، مقالوں اور کالموں کا مصنف ہو اور جس کی قلمی و علمی

صلاحیتوں کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی تسلیم کیا جارہا ہو۔میں اپنے آپ کو ایک معمولی ادیب تصور کرتا ہوں لیکن برِ صغیر ہندو پاک کے مقتدر نقاد اگر مجھے صفِ اول کا انشاء پرداز اور صاحبِ طرز مانیں اور مقامی دانشور طبقے کا ایک قابلِ لحاظ حصہ یہ تسلیم کرے کہ میں نے کشمیر میں اردو کالم نویسی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو اس سے پہلے نہیں ملتی۔تو سلیم سالک، کو مجھے شاملِ جائزہ کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔اگر انہیں میرا نام اور میرا کام معلوم نہیں تو اس کا راست مطلب یہ ہے کہ وہ کشمیر میں اردو کے حوالے سے طفلِ مکتب ہیں اور میرے خیال میں ایسے بچوں کو نشاط شالیمار میں رنگ برنگی تتلیوں کا پیچھا کرنا چاہیئے ،ادب کے میدانِ خار زار میں قدم رکھ کر اپنے پیروں اور دوسروں کے جذبات کو لہولہان نہیں کرنا چاہیئے۔اگر وہ بلند قامت ادیب ہیں تو اتنے بلند ہیں کہ انہیں صرف دور کی ہی چیزیں نظر آتی ہیں یا اپنے عزیز و اقارب۔صرف دور کی چیزوں کا ہی نظر آنا ماہرین امراضِ چشم کے ہاں Hypermetropia کہلاتا ہے۔اس مرض کے لئے وہ ایک lens تجویز کرتے ہیں جس کی قیمت اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ مریض کی قوتِ خرید سے باہر ہو۔ہوسکتا ہے سلیم سالک کبھی وہ چشمہ لگوائیں۔اس روز وہ ''بشرطِ زندگی''، میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمانے کی زحمت اُٹھائیں تو میں انہیں وہ تمام دستاویز دکھاؤں گا جو مجھے کشمیر میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے کسی بھی تذکرے، جائزے یا تاریخ میں شامل رکھنے کا اہل ثابت کرتی ہیں۔رہا سفر خرچ یعنی ٹی اے، ڈے اے،، وہ میرے ذمہ، کھان پان، بالکل مفت کیونکہ میرے وہ کرم فرما مجھے مہمان نواز کہتے

ہیں جو کبھی میرے غریب خانے میں اپنے قدوم میمنت لزوم کورنجہ فرمانے کا کرم کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوا تو یہ مثل صادق آتی رہے گی کہ ''اندھا بانٹے ریوڑیاں مڑ مڑ کر دے اپنوں کو۔۔۔!!

مخلصؔ صاحب کا یہ کالم میں نے کھڑے کھڑے دو تین بار پڑھا۔ میرا پہلا ردعمل یہی رہا کہ مجھے مخلصؔ صاحب پر بہت غصہ آیا۔ میں نے ارادہ باندھ لیا کہ میں اس کا بھرپور جواب لکھوں گا۔ پورا دن سوچتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ پھر میں نے سنجیدگی اور ٹھنڈے دماغ سے مذکورہ کالم پڑھا تو مجھے مخلص صاحب کا کردار ابھرتے نظر آیا اور جو مجھ سے اس لئے ناراض تھے کہ میں نے ان کا نام نہیں لیا ہے۔ بین السطور غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ مخلص صاحب کو ہمیشہ سے نظرانداز کیا گیا شومئی قسمت کہ یہ نزلہ مجھ پر ہی گرا۔ یہ سوچ کر میں نے ردعمل لکھنے سے پرہیز کیا۔ قسمت کا کھیل بھی نرالا ہوتا ہے۔ 2008ء میں میرا عارضی تقرر ڈگری کالج بارہمولہ میں ہوا۔ روزانہ سرینگر سے بارہمولہ کی مسافت طے کرنا میری زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ امتحانات کے دنوں میں کلاسیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے ایک دن میرے ایک ساتھی محمد اقبال صاحب نے مجھے سوپور آنے کی دعوت دی۔ بس پھر کیا تھا کہ اچانک سوپور لفظ سن کر مجھے سیر جاگیر یاد آیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن ساتھ ہی کہا کہ سوپور تو مجھے جانا ہے لیکن سیر جاگیر تک۔ وہ مجھے گھورتا ہوا کہنے لگا کہ وہاں کون ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ وہاں میرا ایک شناسا رہتا ہے جس نے مجھے دو سال پہلے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ منت سماجت کر کے وہ میری رہنمائی کے لئے تیار ہوا۔ دل میں عجیب کیفیت تھی کہ کیسے رہے گی مخلص صاحب سے ملاقات۔ سوپور تک تو گاڑی مل گئی لیکن سیر جاگیر تک پیدل سفر کرنا پڑا۔ قریباً آدھے گھنٹے کا پیدل سفر باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں کیسے طے ہوا۔ جوں ہی ہم نے مخلص صاحب کے مکان

کی دہلیز پر قدم رکھا تو ایک خاتون برآمدے میں کھڑی تھی۔انہوں نے اندر جا کر کسی کو اطلاع دی۔تو سر پر ٹوپی سجائے، پھرن زیب تن کئے شگفتہ چہرے کے ساتھ ایک بزرگ دروازے پر نمودار ہوئے۔میں نے سلام و دعا کے بعد مخلصؔ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔انہوں نے میرا نام پوچھا۔جوں ہی میرے منہ سے سلیم سالکؔ نکلا تو انہوں نے بڑے تپاک سے کہا کہ میں ہی تمہارا برادشمن عبدالرحمان مخلصؔ ہوں۔پہلے گلے ملایا پھر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے کمرے میں لئے گئے، جہاں کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ہمیں کمرے میں بٹھا کر خود باہر نکل گئے۔ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ ایک چھوٹا لڑکا ہاتھ میں ''طشت ناری'' (طشت و آفتابہ) اور دستر خوان لے کر ہمارے سامنے نمودار ہوا۔طشت ناری دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کھانے کا انتظام ہو رہا ہے۔میرا دوست میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں مخلصؔ صاحب سے مخاطب ہوا، جناب یہ کیا ہے، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں نے زندگی میں سوائے وفا کے کچھ حاصل نہیں کیا ہے اور میں نے وعدہ کیا تھا جب آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں گے میں کھان پان کا ذمہ لوں گا۔میں حیران ہوں کہ روایتی وازہ وان کے پکوانوں کا انتظام کہاں سے ہوا ہوگا، کیونکہ آتے وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگوں کو گھر کا سودا سلف لانے کے لئے سوپور تک کا سفر کرنا پڑتا ہوگا۔ایسی ضیافت پھر کہیں نصیب نہیں ہوئی۔شاید اخلاص کا جو عنصر اس دعوت میں تھا اس کا عشر عشیر بھی ہمارے یہاں ملنا مشکل ہے۔کھانے کے بعد مخلص صاحب نے اپنے بارے میں کئی باتیں کیں۔جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ مخلصؔ صاحب پڑھنے لکھنے میں اتنے مخلص ہیں کہ انہیں پتہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں کہاں کہاں شائع ہوتی ہیں۔ادب ہو یا سیاست، تاریخ ہو یا لغت ہر موضوع پر بصیرت آمیز معلومات سے ہمیں نوازتے رہے۔دو گھنٹوں کی اس طویل ملاقات نے مجھے مخلص صاحب کے بہت قریب

کر دیا، یہاں تک کہ اب ہر اتوار ان سے بات ہوتی تھی۔ جب بھی مجھے کسی علمی معلومات کی ضرورت پڑتی، میں مخلصؔ صاحب کو یاد کرتا اور حسبِ سابق شگفتگی سے جوابات مرحمت فرماتے۔ میری خوش نصیبی تھی کہ میرا کالم ''صریرِ خامہ'' کافی دنوں تک ان کے کالم کے ہمراہ چھپتا رہا، جو میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ جب میری کتاب ''جموں و کشمیر کے منتخب اردو افسانے'' شائع ہوئی تو انہوں نے بہت ہی حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔ اور بر سبیل تذکرہ اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

''اہلِ زبان آج بھی کشمیر کے اردو لکھنے والوں کو گھاس ڈالنے کے روادار نہیں حالانکہ وہ خود اپنے ہاں سے اس زبان کو دیس نکالا دے چکے ہیں اور ریاستِ جموں و کشمیر اس کی آخری پناہ گاہ بن گئی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح عرب اپنی زبان دانی کے باعث باقی دنیا کو ''عجم'' (گونگے) کہتے تھے اور کہتے ہیں۔ اسی طرح سے دلی، لکھنؤ والے بھی اس زعم میں مبتلا ہیں کہ اردو ان کی میراث ہے اور اس کے جملہ حقوق ان کے حق میں محفوظ ہیں ''اہلِ زبان'' کا لقب بجا لیکن کوئی بھی زبان کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ صرف اس کی میراث بن جاتی ہے جو اس کی آبیاری اور نگہداشت کر سکے اور وہ کشمیر میں اچھی طرح سے ہو رہی ہے۔ اس لئے کسی بھی اچھے اردو شاعر یا ادیب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ خود کو ثابت کرے اور اس کے لئے اسے اہلِ زبان خواتین و حضرات کی تصدیق کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ خود اہلِ زبان کے میڈیا کو ذرا غور سے دیکھئے اور سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ وہ کتنی معیاری اردو لکھتے بولتے ہیں۔''

مذکورہ اقتباس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مخلصؔ صاحب کو یہ احساس تھا کہ اہلِ زبان کشمیریوں کو ہمیشہ یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ ہمیں صحیح اردو لکھنا ہی نہیں آتی اور

خود مخلص صاحب پچاس برس سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ان کے کالم پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اردو زبان پر کیسی استادانہ مہارت حاصل تھی۔ایک ہزار سے زائد کالم، مضامین، افسانے، انشائیے، تبصرے تحریر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔لیکن انہیں اس بات کا گلہ تھا کہ انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔اگرچہ مشہور ماہر اقبالیات آنجہانی جگن ناتھ آزاد نے ان کے کالم کو ''تصنیفِ لطیف'' بھی قرار دیا ہے اور محمد یوسف ٹینگ اعتراف کرتے ہیں کہ کشمیر میں اتنی شستہ اور اچھی اردو نثر لکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔اس میں دو رائے نہیں ہے کہ مخلص صاحب کے انتقال سے ریاست میں اردو کالم نویسی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو پُر کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

......●......

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

مشہور انگریزی افسانہ نگار او۔ ہنری کی کہانی After twenty years ہمارے بارھویں جماعت کے نصاب میں شامل تھی، جس میں دو دوست ایک دوسرے سے بیس سال بعد ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ بیس سال گزرنے کے بعد جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں متضاد صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک کارنامہ شمس الدین شمیم نے کر دکھایا، جب انھوں نے اپنے دوستوں کو بیس سال بعد ایک جگہ پر جمع کیا۔ جو گزشتہ صدی کے ساتویں اور آٹھویں عشرے میں کبھی تلاش ادب تو کبھی رائٹرس کلب کے روح رواں تھے۔ یہ ایک ایسی محفل تھی، جس میں کوئی ایجنڈا تھا نہ ہی کوئی منضبط پروگرام۔ ہر آنے والا دوسرے سے گلے ملتا، مصافحہ کرتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کرتا کہ ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ اس سوال کا جواب سوائے شمیم کے کون دے سکتا تھا، لیکن شمیم کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بقول غالب ؏

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں

کمرے کے ایک کونے میں سلطان الحق شہیدی، فرید پربتی، ایس۔ ایم قمر اور عبدالرشید فراق ادبی گفتگو میں محو تھے تو دوسری طرف سجاد حسین اور اعجاز بانڈے

سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔اسی اثناء میں دروازے پر قہقہہ مارتے ہوئے چند چہرے نظر آئے، جن میں جاوید آذر، خالد بشیر، غلام نبی شاہداور رفیق ہمراز تھے۔محفل میں علیک سلیک کی آوازیں بلند ہونے لگی۔ابھی محفل کا رنگ جما ہی تھا کہ ایک سفید ریش بزرگ نے بلند آواز سے سلام کرتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب کھسر پھسر کرنے لگے کہ یہ کون صاحب ہیں لیکن جاوید آذر کی پارکھ نظران کو پہلے ہی پہچان گئی۔وہ سفید پوش بزرگ سے گلے ملتے ہی چلا اُٹھے، مُنیر تم تو بوڑھے ہو چکے ہو۔منیر صاحب نے برجستہ جواب دیا، خود کو کبھی آئینہ میں دیکھا ہے۔یہ سن کر سب ہنسنے لگے اور احتراماً کھڑے ہوگئے کہ اب محفل میں مزہ آئے گا، کیونکہ منیر احمد منیر، جن کی سنجیدہ باتوں سے بھی مزاح کے پھوارے پھوٹتے ہیں، ہمارے درمیان موجود ہیں۔دروازے پر عمر مجید کی صدا سنائی دی، کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ہر ایک ان کو اپنی بغل والی جگہ دینے پر آمادہ تھا، لیکن وہ تو موقعہ شناس نکلے، انہوں نے اپنے یارِ خاص منیر احمد منیر کو ہی ترجیح دی۔اسی اثناء شمس الدین شمیم کی آواز سنائی دی کیا سب آگئے۔ تو سلطان الحق شہیدی نے فقرہ کستے ہوئے کہا، برخوردار خود دیکھ لو کتنے باراتی ساتھ لینے ہیں۔ایک ایک کر کے سب جمع ہوگئے، سبھوں کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے، دبے دبے ہونٹوں میں ایک دوسرے سے شکایت کرتے کہ کیا سچ مچ ہم نے اتنے برس غیروں کی طرح گزارے، ایک دوسرے سے بے خبر، جیسے کبھی ملے ہی نہیں تھے۔کوئی وقت کو موردِ الزام ٹھہراتا، تو کوئی زندگی کی مصروفیات کا رونا روتا۔غرض سبھی حیران و پریشان سوچ رہے تھے کہ شمیم کے دل میں کیا سوجھی کہ اس نے سب کو جمع کیا ہے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، جیسے بات کرنے کا کوئی بہانا ڈھونڈ رہے ہوں۔شمیم نے نہایت سادگی سے کہا کہ مجھے اپنے دوستوں کی یاد ستانے لگی، میں نے غنیمت سمجھا کہ سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کوئی بہانا تراشا جائے۔ساتھ ہی بیس سال

پرانے واقعات کا پلندہ کھلنے لگا۔منیر احمد منیؔر نے تلاش ادب کی بات چھیڑتے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کیں۔جیسے کسی بچے کو نانی کی کہانی یاد آگئی ہو اور وہ بضد ہو کہ سب اس کو سنیں۔عمر مجید نے کئی ایک واقعات سنائے تو شمس الدین شمیؔم نے بھی محفل میں رنگ جمتے ہی ادیبوں کے معاشقے چھیڑ دیئے۔سب دلچسپی کے ساتھ سننے لگے۔ سلطان الحق شہیدی نے کئی رنگارنگ واقعات سنائے،سب ماضی کی دُھندلی یادوں میں کھو گئے،کچھ تو آنسوں کو روکنے کی ناکام کوشش میں لگے تھے۔جیسے سب بزبان غالبؔ دل کی کیفیت بیان کر رہے ہوں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاق نسیاں ہوگئیں

خدا جانے شمس الدین شمیم کے دل میں کیا سوجھی وہ فوراً اٹھے اور سب کو کھانے کی طرف متوجہ کیا کہ پہلے کھانا،پھر رونا۔کھانے کا خاص انتظام رکھا گیا تھا، جس میں وازوان کے سارے پکوان موجود تھے،جیسے سچ مچ شمیم دلہا تھا اور ہم سب باراتی۔کھانے کے بعد پھر محفل جمی تو شمیم صاحبؔ پھر باہر کی طرف دوڑتے دکھائی دیئے،لیکن اکیلے نہیں لوٹے بلکہ ساتھ میں ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔اس کو حسن اتفاق ہی سمجھئے یا شمیؔم کی بزلہ سنجی کہ فوٹو گرافر بھی ایک نیم شاعر نکلا۔اب یہ کیسے ممکن تھا کہ چند شعراء ایک جگہ جمع ہوں اور وہ اپنے کلام کے دفتر کھولنے کی کوشش نہ کریں۔بس پھر کیا تھا کہ شہیدیؔ صاحب نے بغل میں چھپائی ہوئی بیاض نکالی اور اپنے مخصوص انداز میں اشعار گنگنانے لگے بقول جاوید آذر شہیدی صاحب ''خ'' کو اپنے اصلی مخرج سے ادا کرتے ہیں تو شعر کھنکھناتے ہیں۔ابھی شہیدیؔ صاحب دل کی بھڑاس نکال ہی رہے تھے کہ منیر احمد منیؔر نے بھی مزاحیہ انداز میں ڈوبی دو کشمیری غزلیں سناڈالیں کہ کہیں شہیدی صاحب کا تفکر آمیز کلام سن کر سب کی طبیعت بھاری نہ ہو جائے۔جاویدؔ آذر

نے فرید پربتی کو بھی دعوت دی کہ وہ بھی اپنے کلام سے نوازیں۔غلام نبی شاہد کا افسانہ "بھوشن لال کیاز گوہ وٹس" سنتے ہی محفل سنجیدہ ہوگئی۔کہانی میں کشمیر کے پُر آشوب حالات کی عکاسی اس طرح کی گئی تھی کہ سب حیرت میں پڑ گئے۔شاہد صاحب نے اتنی بڑی کہانی اردو میں کیوں نہیں لکھی، کاش شاہد صاحب اس کو اردو میں لکھتے، تو ان نام نہاد افسانہ نگاروں کو پتہ چلتا کہ سچ مچ کشمیر میں کیا حالات ہیں، جو تخیل کی بنیاد پر اس موضوع پر لکھتے ہیں۔منیر صاحب نے کہانی سنتے ہی کہا اگر میں یہ کہانی شاہد کی زبانی نہ سنتا تو میں اس کو اختر محی الدین کے کھاتے میں ڈال دیتا۔محفل کا ماحول دیکھ کر خالد بشیر ایک کونے میں کچھ سوچ رہے تھے کہ جیسے ان کو بھی اپنے چند اشعار سنانے کا موڑ بن رہا ہو۔محفل کا رنگ اتنا جم چکا تھا کہ جیسے کسی کو گھر جانے کی جلدی نہیں تھی، لیکن وقت کا کیا کیا جائے گھر تو ہر حالت میں پہنچنا تھا، ورنہ گھر والوں کے دلوں میں بُرے خدشات جنم لیتے۔

اس ملاقات کے بعد میں نے شمیم صاحب کے افسانوی مجموعہ "ویرانے" کی تلاش شروع کردی۔بدقسمتی سے خود شمیم صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔میں نے بڑی تگ ودو کے بعد دسٹرکٹ لائبریری سے "ویرانے" کو تلاش کیا۔جب شمیم صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بڑے جذباتی ہوکر مجھ سے اس کی ایک زیراکس کاپی لی۔وقت گزرتا گیا اور میں اپنی کتاب "جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے" کے لئے افسانوں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔اسی دوران مجھے شمیم صاحب کے کئی افسانے پڑھنے کا موقعہ ملا۔کافی مطالعہ کرنے کے بعد "مکان نمبر 370" کا انتخاب کیا کہ جس میں کشمیر کی پوری سیاسی تاریخ تخلیقی انداز میں پیش کی گئی ہے۔

ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور شمیم صاحب سے قربت بڑھتی گئی۔جب بھی ان کا کوئی افسانہ شائع ہوتا تو ضرور پوچھتے کہ افسانہ کیسا لگا۔پھر اگر کوئی قابلِ

بحث بات ہوتی تو ہفتوں اس میں صرف کرتے کہ میں نے صحیح لکھا ہے۔ تھرائیڈ افسانے پر اچھی خاصی گفتگو ہوئی، جوں ہی میں نے عنوان پر اعتراض کیا تو فوراً کہنے لگے برخوردار مطالعے کے ساتھ تجربے کا ادراک بھی ضروری ہے۔ ابھی تم عمر کے اس پڑاؤ پر نہیں پہنچے ہو جہاں تھرائیڈ کے عنوان کو تم صحیح معنوں میں سمجھ سکو۔ پھر طویل مدت کے بعد ملے تو افسانچوں کی سوغات لے کر نمودار ہوئے۔ منٹو سے معذرت چاہتے ہوئے ''کھول دو'' کے عنوان سے ایک ایسی کہانی تخلیق کی، جس میں آج کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔

جب بھی ملتے ہشاش بشاش اور اپنائیت سے ملتے، باتوں باتوں میں اپنے کشمیری افسانوں کے بارے میں ضرور تذکرہ کرتے۔ ایک بے چینی سی تھی کہ کشمیری افسانوں کا مجموعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ آج شمیم صاحب کے چلے جانے کے بعد میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ او۔ ہنری نے اپنی کہانی کی بنیاد تخیل پر رکھی جبکہ ہمارے او ہنری (شمس الدین شمیم) نے تو حقیقت میں بیس سال بعد دوستوں کو ملا۔ اس طرح شمیم مرحوم نے او ہنری کی کہانی کو عملی جامہ پہنا کر تاریخ کا ایک باب رقم کیا اور خود کہانی کا کردار بن کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

......●......

افسانہ لکھ رہا ہوں افسانہ ہو رہا ہوں

جی ہاں میں افسانہ کی بات کر رہا ہوں، جس کے بارے میں بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ اس میں ایک کہانی ہوتی ہے۔ کہانی جس کو واقعات کی کڑیوں سے جوڑا جاتا ہے،، مکالموں سے کرداروں کی تشکیل ہوتی ہے، منظر نگاری اور جزیات نگاری سے ایک ماحول بنتا ہے جس سے کہانی کا ہر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور قاری ایک نئی دنیا سے آشنا ہو جاتا ہے۔ یہی بنیادی لوازمات ہیں جن سے ایک افسانہ وجود میں آتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ افسانہ لکھا نہیں بلکہ بُنا جاتا ہے۔ ایک ماہر سوزن کار کی طرح، جو سوئی دھاگے کی مدد سے کپڑے پر گل بوٹوں کی بہار اس طرح سجاتا ہے کہ جیسے چمن سے حقیقی پھولوں کو چن کر کپڑے پر چسپاں کیا گیا ہو۔

اس کے برعکس جب ہم موجودہ دور کا افسانہ پڑھتے ہیں تو اکثریت ان افسانوں کی ہے جو کسی مضمون کا متن معلوم ہوتے ہیں یا کسی انشائیے کا حصہ۔ بیانیہ میں کوئی ربط نہیں ہوتا اور موضوع بھی اتنا پامال کہ عنوان سے ہی پتا چلتا ہے کہ پوری تحریر قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ یہ تحریریں شاید یہ سوچ کر لکھی جاتی ہیں کہ قارئین کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ تبصرہ یا تجزیہ کریں بلکہ نام چھپنا چاہئے بس۔ بعض حضرات اس زعم میں مبتلا ہیں کہ بھاری بھرکم لفظیات سے افسانہ قاری پر حاوی ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب قاری افسانہ پڑھتے وقت گنجلک اور دقیق الفاظ کا سامنا کرتا ہے تو وہ افسانہ سے کنارہ کش ہونے میں ہی عافیت سمجھتا ہے اور اس طرح افسانہ خود بخود قاری پر حاوی ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار نئے لکھنے والے یہ سوچتے ہیں کہ افسانہ میں زبان و بیان کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ ایک روزنامہ اخبار کی طرح کچھ واقعات کو ایک سلسلے میں جوڑ کر افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے افسانہ کی روح مجروح ہوتی ہے۔ افسانہ نگاروں کا ایک اور طبقہ وہ بھی ہے جو افسانہ میں نام نہاد علامتوں اور استعاروں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور خود علامتوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ایک جملے کو کئی حصوں میں بانٹ کر غیر ضروری نکتے ڈال کر ابہام پیدا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی جاتی ہے، جب ان افسانوں کو سنجیدگی سے پڑھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر ضروری نکتے عبارت کے حسن کو بگاڑ دیتے ہیں۔ بعض حضرات افسانے میں تجریدیت کے نام پر شاعری کرتے ہیں اور ان افسانوں میں ابتدا کی خبر ہوتی ہے نہ انتہا معلوم۔ خود ہی لکھتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دیتے ہوئے اپنے افسانے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ افسانچوں کے نام پر چٹکلے لکھے جاتے ہیں جن پر ہنسنے کے سوا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس طرح کے افسانوں سے رسالوں اور اخباروں کا پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن قاری کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

میرے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب پریم چند کی حقیقت نگاری، منٹو کی بے باکی، بیدی کی جزیات نگاری، کرشن چندر کی منظر نگاری، انتظار حسین کی قصہ گوئی، قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور، عصمت چغتائی کی نسوانیت، سریندر پرکاش کی علامت، خواجہ عباس کی سادگی، پریم ناتھ در کی فنکاری، جوگندر پال کا اختصار، بلراج مین را کا فلسفہ، نور شاہ کی رومانیت، ساجد رشید کی نشتریت، عمر مجید کی

آشوبیت، سلام بن رزاق کی پختگی اور شوکت حیات کی رمزیت بالکل مفقود ہو چکی ہے۔ کیا اب کفن، ٹوبہ ٹیک سنگھ، آنندی، گرم کوٹ، ٹھنڈا گوشت، لحاف، ایک فرلانگ لمبی سڑک، آخری آدمی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، بجوکا، ماچس، دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم، کابلی والا، گڈریہ، معبر، میری گلی کا غم، ایک لمحہ کی جنت، ایک مردہ سر کی حکایت، نیم پلیٹ جیسے افسانے تخلیقی قالب میں نہیں سما سکتے۔ کیا آج کے دور کا انٹرنیٹ اور دوسری سہولت رکھنے والا افسانہ نگار معیاری اور شاہکار افسانے لکھنے سے قاصر ہے، جبکہ ایک زمانے میں بے سروساماں افسانہ نگار اعلیٰ پائے کے افسانے تخلیق کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کی ترقی سے موضوعات بدل سکتے ہیں لیکن فن کی باریکیوں سے مفر ممکن نہیں۔ اس ساری صورتحال کی عکاسی ریاست کے نوجوان شاعر سلیم ساغر کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

دونوں جہاں سے بالکل بے گانہ ہو رہا ہوں
افسانہ لکھ رہا ہوں افسانہ ہو رہا ہوں

مجھے معلوم ہے کہ میری باتوں سے اختلاف کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے لیکن حقائق کی نشاندہی کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ میرے لکھنے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ اب افسانہ بالکل زوال پذیر ہو چکا ہے بلکہ آج بھی کئی افسانہ نگار تکنیکی اور موضوعاتی طور پر مکمل افسانے تخلیق کرتے ہیں۔ میری گزارش ان افسانہ نگاروں سے ہے جنہوں نے سنجیدگی سے اس صنف کے دامن کو پکڑے رکھا ہے کہ وہ زبان و برتاؤ کا استعمال فنکاری سے کریں تاکہ صحیح معنوں میں ایک افسانہ تخلیق ہو سکے۔ کبھی کبھار ایک اچھی کہانی ذہن میں ہوتے ہوئے بھی افسانہ نگار اس کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے میں ناکامیاب رہتا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تخلیقی عمل میں کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر موضوع اور متن کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو وہ بھونڈا

مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔زندگی کے تجربات کی بھٹی میں، مطالعہ ومشاہدہ کے بل بوتے پر، تخیل کی لامحدود پرواز کوملاتے ہوئے ایک معیاری افسانے کی بنیاد رکھی جائے تو وہ تخلیق خود بخود اپنالوہا منواتی ہے۔

اپنے اس کالم کا اختتام میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس چشم کشا اقتباس سے کرنا چاہوں گا، جس میں وہ ایک افسانہ نگار سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ

''ایک افسانہ نگار کا معمول ہونا چاہئے کہ وہ روزانہ ایک افسانہ کا مطالعہ کرے اور ایک مہینے کے بعد ایک افسانہ تخلیق کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ تیس افسانوں کے مطالعے سے ایک افسانے کی تخلیق میں کتنی پختگی اور سنجیدگی آتی ہے وہ آپ راجندر سنگھ کے افسانوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں''۔



زندہ تھا موت سے ہم آغوش رہا

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب شاگرد بھی استاد سے کم نہ ہوتے تھے۔علم وادب کے اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ ایک کالج میں ریاضی کے نئے اُستاد کا تقرر ہوا۔ریاضی کے پیریڈ میں استاد ابھی کلاس میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ طالب علموں کو نہ جانے کیا شرارت سوجھی۔ان میں سے ایک طالبِ علم نے کہا کہ میرے پاس ایک ترکیب ہے مگر ایک شرط ہے کہ کوئی بتائے گا نہیں کہ یہ شرارت کس کی ہے۔باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ کوئی کسی کے بارے میں زبان نہیں کھولے گا، چاہے کچھ بھی ہوجائے۔بعدازاں بچے نے چاک اُٹھایا اور بلیک بورڈ پر اپنا ایک شعر لکھا، جو کچھ اس طرح تھا۔

دعویٰ بہت ہے علمِ ریاضی میں آپ کو
طولِ شب فراق ذرا ناپ دیجئے

تھوڑی دیر میں ریاضی کے اُستاد کلاس میں داخل ہوئے، سب بچے سر جھکائے ہنس رہے تھے لیکن اُستاد ان تمام باتوں سے لاعلم جب بلیک بورڈ کی طرف آئے تو اس شعر کو دیکھ کر کچھ چونکے اور تھوڑے سے حیران ہوئے اور تھوڑے سے خوش بھی۔کیوں کہ شعر اعلیٰ پائے کا تھا۔انہوں نے مسکرا کر بچوں کی طرف دیکھا۔بچے بڑے دبک کر بیٹھے تھے کہ اب اُستاد ہم سے پوچھیں گے کہ یہ کس نے لکھا ہے اور یہ بدتمیزی کس نے کی ہے لیکن اس وقت ان سب کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی، جب

اُستاد نے چاک اُٹھایا اور اس کے نیچے ایک شعر لکھ دیا اور بچوں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ شعر کچھ اس طرح تھا۔

طولِ شبِ فراق جو ناپا گیا غریب
لیلیٰ کی زلف سے رہا دو چار ہاتھ کم

اسی نوعیت کا ایک واقعہ میری زندگی میں بھی پیش آیا ہے جب میرا داخلہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ پہلے ہی دن ریگنگ کی بدولت غبارے سے ہوا نکل گئی، جس کے اثرات کئی دنوں تک رہے۔ آخر پر ہمت جٹائی تو Regular کلاسیں لینا شروع کیں۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ خالی کلاس دیکھ کر میرے دل میں جانے کیا سوجھی کہ میں صدرِ شعبہ کے پاس چلا گیا، تو انہوں نے سر ہلائے بغیر کہا کہ تم فرید پربتی سے ملو، وہ تمہاری کلاس لیں گے۔ فرید پربتیؔ کا نام میں نے کئی رسالوں میں پڑھا تھا لیکن بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فریدؔ صاحب کے کمرے کی راہ لی، ابھی دروازے کا پردہ تھوڑا کھسکا یا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کمرے میں دو صاحبان بیٹھے تھے۔ ایک اپنا کلام سنا رہا تھا تو دوسرا ہمہ تن گوش آنکھیں بند کئے کلام سن رہا تھا۔ کلام سنانے والا دور سے ہی شاعر لگ رہا تھا، اس کے گیسو دراز اور لباس شاعرانہ تھا لیکن سننے والا چوڑا بدن، خوبرو، دراز قد، بارعب، کلین شیو اور سوٹ بوٹ والا، کسی بھی طور شاعر نہیں لگ رہا تھا۔ میں مخمصے میں پڑ گیا کہ فریدؔ صاحب کون ہوسکتے ہیں کیوں کہ دونوں کھڑکی سے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور فریدؔ صاحب کی گھومنے والی کرسی (Moveable Chair) خالی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اجازت طلب کی تو سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں ساکت وجامد ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا اور سمجھ گیا کہ فریدؔ صاحب کون ہوسکتا ہے۔ میں اندر ہی اندر اپنے آپ پر ہنس رہا تھا کہ پربت جیسا شخص ہی فرید

پربتی ہوسکتے ہیں اور آج اسم بامسمیٰ کے معنی بھی سمجھ میں آرہے تھے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہی مجھے پتا چلا کہ شاعر موصوف چار چار مصرعوں پر مشتمل اپنا کلام سنا رہے تھے کہ اچانک فریدؔ صاحب شاعر سے مخاطب ہوئے کہ کیا تم نے ریاضی کا مطالعہ کیا ہے؟ یہ سوال سن کر شاعر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ رباعی اور ریاضی کا آپس میں کیا تعلق؟ فریدؔ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ برخوردار غزل اور نظم کے لئے خالص شاعر ہونا کافی ہے لیکن رباعی ریاضی کی مانند پیچیدہ اور مشکل فن ہے۔ عمر خیامؔ رباعی میں اس لئے کامیاب ہوا کیوں کہ وہ ریاضی کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ رباعی کے لئے مقررہ چوبیس اوزان کا فارمولہ استعمال کرنا گویا دانتوں میں پسینہ آنے کے برابر ہے۔ مجھے دیکھوں میں نے ایم۔اے کامرس کیا ہے شاید اسی لئے رباعی کی صنف کو قابو کر پایا ہوں۔ میری صلاح مانو رباعی کے بجائے غزل میں طبع آزمائی کرو۔ اس واقعہ کے بعد روز فریدؔ صاحب کے ساتھ ملاقات ہوتی رہیں۔ کلاس میں یا کلاس کے باہر، ہر جگہ شعر وادب کے متعلق باتیں ہوتیں۔

فریدؔ صاحب کلاس میں آتے ہی کلاسیکل شعر وادب کی پھلجھڑیاں **بکھیرتے** رہتے، ادبی لطیفوں سے کلاس کو زعفران زار کر دیتے، جس سے نصاب کی تھکاوٹ دور ہوتی۔ اشعار اس طرح ازبر تھے کہ ایک مصرعہ کہنے پر پوری غزل سنا دیتے، کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اپنی رباعیاں بھی سنا دیتے۔ نو آموز شعراء کو سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے، نئی نئی کتابیں خریدنے میں پہل کرتے، ادبی جرائد پڑھنے کی صلاح دیتے۔ جس کو مدد کی ضرورت ہوتی، اس کی دامے، درمے اور سخنے مدد کرنے سے کبھی نہیں کتراتے لیکن جب کسی سے کبیدہ خاطر ہوتے تو اس کی خوب خبر لیتے۔

ایم اے مکمل کرنے کے بعد مجھے ایم فل کرنے کی تلقین کی۔ ساتھ ہی اس بات کی یقین دہائی کی کہ وہ مجھے اپنی نگرانی میں ریسرچ کرائیں گے۔ کچھ عرصہ بعد میری

رجسٹریشن ''اردو کے ضرب المثل اشعار'' کے عنوان کے تحت ہوئی۔ موضوع چونکہ پیچیدہ تھا، میرے لئے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ ضرب المثل اشعار، زبان زد اشعار، برجستہ اشعار اور آوارہ گرد اشعار میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے شفقت آمیز طریقے سے میری نگرانی کی اور وقتِ مقررہ سے پہلے ہی میرا مقالہ تیار ہوگیا۔ آخر تک ان کی یہی کوشش تھی کہ میں یہ مقالہ شائع کروں لیکن میری تساہل پسندی سے یہ کام التوا میں پڑ گیا، جس کا ان کو بہت دکھ تھا۔ ریسرچ کے دوران ہی مجھے اخبارات اور رسائل میں لکھنے کی ترغیب دی اور یہ نصیحت کرتے رہے کہ لکھنے سے تحریر نکھر جاتی ہے۔

فریدؔ صاحب جب بھی کوئی تازہ شعر یا رباعی تخلیق کرتے تو مجھے ضرور سناتے اور ساتھ ہی داد بھی وصول کرتے۔ ان کے کئی شعری مجموعوں کا پروف میں نے پڑھا ہے، یہاں تک کہ ان کی ایک کتاب کا نام بھی میں نے تجویز کیا تھا۔ جب میں ان کی شخصیت اور فن پر کتاب مرتب کر رہا تھا تو انہوں نے خطوط کا ایک بڑا پلندہ سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ انتخاب کرتے وقت میرے استاد علی احمد جلیلی کے خطوط قلم زد نہ کرنا کیونکہ یہ خط میرے لئے کسی قیمتی اثاثہ سے کم نہیں۔ ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو بھی مضامین ملے ان کی ایڈیٹنگ کرنے میں کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ یہاں تک کہ ترتیب و تہذیب کو بھی میری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ لیکن جب کتاب کا عنوان طے کرنے کا وقت آیا تو میرے منہ سے بے ساختہ '' فرید پربتی ...... شعر، شعور اور شعریات'' نکلا تو میری رائے کی تائید کی۔

فریدؔ صاحب کا زندگی کا نظریہ اور لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اختلافِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے۔ شاید اسی لئے ان کی ہمعصر شعراء کے ساتھ زیادہ نہیں بنتی۔ وہ ہر کام میں عجلت آمیز مستعدی سے کام لیتے۔ ان کے روابط اردو دنیا سے بہت زیادہ استوار تھے۔ وہ ہر سال ایک یا دو کتابیں شائع کرتے

جیسے انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ زندگی وفا نہیں کرے گی۔ ''ابر تر'' سے ''ہجومِ آئینہ'' تک کا تخلیقی سفر آٹھ شعری مجموعوں میں مکمل کیا۔ کم عمری میں ہی ان کی شخصیت سراپا شعر بن گئی تھی۔ وہ تقریر میں ماہر نہیں تھے لیکن تحریر میں ان کے فن کا جادو بولتا تھا۔ ان کی رباعیوں کے بارے میں کسی کو اختلاف نہیں کہ انہوں نے ریاست کا نام رباعی کے فن میں بہت دور تک پہنچایا ہے۔ کلیات داغ کی تدوین کے لئے بہت کوشاں تھے، اس کے لئے NCPUL سے ایک تحقیقی پروجیکٹ بھی منظور کروایا تھا۔ اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھتے ہوئے تحقیقی وتنقیدی مقالے بھی تحریر کرتے رہتے۔

پھر وقت گزرتا گیا اور میرا یونیورسٹی جانا کم ہوتا گیا، جس کا ان کو بہت گلہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یونیورسٹی کے ساتھ رابطہ بحال رکھوں لیکن میری کچھ گھریلو اور منصبی مجبوریاں تھیں۔ جن کی وجہ سے پی ایچ ڈی میں داخلہ ہونے کے باوجود بھی اپنا ریسرچ کا سفر جاری نہ رکھ سکا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں ان کی صحبت سے دور ہوتا گیا۔ اتنا دور جس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ان کی بیماری کی خبر ملی تو میں جموں میں رہائش پذیر تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ فون پر ہی عیادت کروں لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ اکثر و بیشتر ان کا شگفتہ چہرہ سامنے آتا اور دل میں ایک ہوک اُٹھتی تھی۔ پھر کئی دنوں بعد معلوم ہوا کہ ان کو میڈیکل انسی ٹیوٹ صورہ لایا گیا ہے تو میری چھٹی حس نے مجھے کشمیر آنے کے لئے اُکسایا۔ جوں ہی میں ان کی عیادت کے لئے ہسپتال پہنچا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ کیونکہ میں نے فرید صاحب کو ہمیشہ ہشاش بشاش دیکھا تھا، ہر بات پر قہقہہ مارنا ان کی عادتِ ثانیہ تھی، معمولی بات کو بھی سنجیدگی سے لیتے۔ آج فرید صاحب نحیف ونزاز تھے اور مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی۔ چہرے پر آکسیجن کا ماسک چڑھا ہوا تھا۔ وہ چہرا جو ہمیشہ کلین شیو ہوا کرتا تھا آج سفید داڑھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں وراڈ کے کونے میں ایسے ساکت وجامد مبہوت ہو کر رہ گیا

جیسے میری رگوں میں خون منجمد ہوگیا ہو اور آنسو خود بخود راستہ ڈھونڈنے لگے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر ابھر آیا جب میں نے پہلی بار فریدؔ صاحب کو دیکھا تھا۔ اس دن وہ ایک شاعر کو ریاضی کی اہمیت سمجھا رہے تھے اور آج خود ایک ماہر ریاضی دان کی طرح وقت کی قلیل گھڑیوں کو گن رہے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے بعد ہی پتا چلا کی فرید صاحب نے زندگی کی کشمکش چھوڑ کر امن وسکون کی راہ اختیار کر لی ہے۔ جس کا اشارہ انہوں نے پہلے ہی ایک رباعی میں دیا تھا۔

باہوش تھا لیکن میں بے ہوش رہا
زندہ تھا موت سے ہم آغوش رہا
ایسے بھی مقاموں سے گزرا ہوں فریدؔ
وہ کہتا رہا اور میں خاموش رہا

......●......

سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

ہر قلم کار کے تخلیقی تجربے اپنی اپنی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کسی کو مخصوص اوقات ہی راس آتے ہیں تو کوئی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ کوئی آمد کا متلاشی ہوتا ہے تو کوئی آورد کی مشق و ممارست میں محو ہوتا ہے۔ کوئی حظ و لطف کے لئے لکھتا ہے تو کوئی اپنے تجربات کو دلچسپ انداز میں لکھ کر قارئین کی داد و دہش کا آرزومند ہوتا ہے۔ کوئی تخلیق کے لئے مطالعہ کو ضروری گردانتا ہے تو کوئی مشاہدہ کے عمل کو تخلیق کی اساس مانتا ہے، کوئی ادب کو برائے ادب، تو کوئی ادب برائے زندگی کا نظریہ اپناتا ہے۔ غرض ہر کوئی کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہی تخلیق کو معرضِ وجود میں لاتا ہے۔

جب مختلف مشاہیر کی تخلیقات کے محرکات سامنے آتے ہیں تو عجیب و غریب باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ معروف اردو افسانہ نگار غلام عباس ایک بار جاڑے کی رات میں اورکوٹ کے نیچے صرف بنیائن پہنے ہوئے سیر کو نکلتے ہیں تو انہیں راستہ میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس وقت وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائیں اور ان کا اورکوٹ اتار دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس لطیف آمیز خیال نے ان سے ایک شاہکار افسانہ ''اورکوٹ'' لکھوایا۔ منشی پریم چند نے ''نیرنگِ خیال'' کے مدیر حکیم یوسف حسن کو اپنے افسانوں کی وجہ تخلیق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعے کے

اظہار کے لئے کہانیاں نہیں لکھتا۔ اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں بنتی، میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ منٹو نے بیدی کو ذاتی خط میں لکھا کہ "بیدی، تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔" بیدی کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ منٹو کا کیا مطلب ہے کہ میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ بیدی مزید لکھتے ہیں کہ مجھے تخیلِ فن پر یقین ہے، جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو من وعن بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ منٹو اکثر کہتے تھے کہ وہ کبھی کبھی سوچے بغیر کسی فرضی کردار کے بارے میں ایک جملہ لکھ دیتے ہیں، پھر اسی کردار سے احوال دریافت کر کے افسانہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار افسانہ کا کردار میری مرضی سے چلنے سے انکار کر دیتا، تو میں اس کو کردار کی نفسیات کے مطابق ہی انجام تک لے جاتا ہوں، جس سے کہانی پیچیدہ بھی بن جاتی۔ منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فحش نگار تھا۔ اس کی کہانیاں جنس پر مبنی ہوتی ہیں۔ منٹو کی سوچ عام تخلیق کار سے بہت مختلف تھی وہ احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں، کیوں نہ اس عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا ہو۔ زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ منٹو کو اس قسم کی کہانیاں لکھنے پر بہت لعن وطعن بھی سہنا پڑا، لیکن اس نے اپنی روش آخر تک نہیں چھوڑی۔

رومانی افسانہ نگار سلطان حیدر جوش اپنی افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت لکھا، جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک

پیدا ہوئی۔ کبھی یہ تحریک دفعتاً وجود میں آئی اور کبھی مہینوں میں اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے۔ کبھی صحبتِ احباب، کبھی ریل کا سفر، کبھی کسی مقام کی سیر اور کبھی کسی غیر معمولی واقعہ کا مشاہدہ۔ ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے لئے افسانہ تخلیق کرنا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ اکثر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقے کی امداد سے پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص جملہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا مصالحہ دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص تحریک کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگے کھلونے بنانا''ہے۔ ممتاز شریں مانتی ہیں کہ میرے افسانے، میرے احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور میرے احساسات زندگی کی تلخیوں سے بھرپور، جو کچھ دیکھتی اور سنتی ہوں، وہی کچھ اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کرتی ہوں۔ تخیلی دنیا میں کھو جانا مجھے پسند نہیں۔ مشاہدات کی تصویر کشی میرا مسلک ہے چونکہ میں مشرقی ہوں اس لئے مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی ماحول میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔ افسانہ اسی وقت لکھتی ہوں جب شدت کے ساتھ کسی چیز کو محسوس کروں۔ میرے نزدیک وہی افسانہ ہے جو حقیقت سے قریب ہو۔ روسی ناول نگار ٹالسٹائی پر عالمی شہرت یافتہ ناول ''جنگ اور امن''، کسی آسمانی کتاب کی طرح نازل نہیں ہوا۔ اسے لکھنے کے لئے ٹالسٹائی نے بے پناہ ریاضت کی۔ اس نے نپولن کے حملے کے بارے میں تاریخ کی کتابیں، روسی جرنیلوں کی یادداشتیں، فوجی افسران کے درمیان خط و کتابت اور اس عہد کے اخبارات، رسائل اور جرائد پڑھنے شروع کیے۔ غرض ہزارہا صفحوں پر پھیلا ہوا سامان اس نے

پڑھ ڈالا۔ وہ ان روسی بوڑھوں سے جا کر ملا، جو نپولین کی افواج سے مختلف محاذوں پر لڑے تھے۔ وہ ان میدانوں میں گیا جہاں روسی اور فرانسیسی فوجوں کی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اس نے میدانوں کی مٹی اُٹھا کر ان کا رنگ دیکھا، انہیں سونگھا۔ مٹی کی سگندھ میں فتح وشکست کے رنگ یکجا تھے۔ وکٹر ہیوگو کو نوتر دام کے قدیم کلیسا کی دیوار پر کسی نامعلوم آدمی کا مدتوں پہلے لکھا ہوا ایک لفظ ''مشیت'' نظر آیا، تو وہ سوچنے لگا یہ لفظ یہاں کس نے، کب اور کیوں لکھا ہوگا۔ یہ خیال اس کے مشہور ناول ''پیرس کا نوتر دام'' کی بنیاد بن گیا۔ عصمت چغتائی لکھتی ہیں ''تنہائی میں لکھنے کی عادت نہیں، چونکہ کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ شور مچتا ہوتا ہے، ریڈیو بجتا ہوتا ہے اور بچے کشتیاں لڑتے جاتے ہیں اور میں لکھتی رہتی ہوں''۔

ہر تخلیق کار اپنی دنیا آباد کرتا ہے اسی لئے مشاہیر کے تخلیقی عمل کے محرکات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے تخلیق کاروں کے موضوعات مختلف ہی نہیں بلکہ منفرد بھی ہوتے ہیں۔ بقول غالبؔ

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

......•......

تجھ سا کہاں سے لاؤں!

۲۰۰۵ء کی بات ہے کہ ہمارے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ارتضیٰ کریم ایک توسیعی لیکچر دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ پروفیسر موصوف نے اردو افسانے کے حوالے سے کچھ بنیادی باتوں پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی۔ آخر پر سوال وجواب کا دلچسپ سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے بھی موضوع کی مناسبت سے پروفیسر موصوف سے یہ سوال کیا کہ جب بھی افسانوں کے حوالے سے تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں کہیں بھی ریاست کے افسانہ نگاروں کا تذکرہ نہیں ملتا، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ میرے سوال پر کچھ دیر توقف کر کے انہوں نے تین وجوہات کی نشاندہی کی۔ جن کا نچوڑ کچھ اس طرح تھا کہ اول کشمیر کے افسانہ نگاروں کے باہر کے رسالوں سے رابطے نہیں، دوئم یا تو ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، سوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اردو میں معیاری افسانے لکھنے سے قاصر ہوں۔ حقائق کی نشاندہی ہونے کے بعد میں نے مصمم ارادہ کیا کہ ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کا ایک جامع انتخاب مرتب کرنا چاہیئے تاکہ اس بات کا ازالہ ہوجائے کہ ریاست کے افسانہ نگاروں کو افسانے لکھنے ہی نہیں آتے۔

پہلے میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ قریباً اسی (۸۰) افسانہ نگاورں کی ایک

طویل فہرست تیار ہوگئی جو کہ میرے لئے حیرت افزا بات تھی۔ ہر افسانہ نگار کو شامل انتخاب کرنا ممکن نہیں تھا۔اس لئے کئی دنوں کی محنت شاقہ کے بعد کل پچیس افسانہ نگاروں کی ایک حتمی فہرست بنانے میں کامیابی ملی۔ جب میں نے اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ڈول ڈالا ،تو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔بعض افسانہ نگاروں نے ''مجذوب کی بڑ'' سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور کئی لوگوں نے درخور اعتناء بھی نہیں سمجھا۔ کچھ افسانہ نگاروں کی تخلیقات پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ان کو افسانہ نگار کس لحاظ سے کہا جاتا ہے تو پروفیسر موصوف کی بات یاد آ گئی کہ یہاں معیاری افسانہ لکھے ہی نہیں گئے ہیں۔اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے پھر اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا تو کچھ مثبت نتائج سامنے آئے۔

افسانوں کی شیرازہ بندی کی شروعات میں نے عمر مجید سے کی۔ان کا ایڈریس معلوم کر کے ان کے گھر واقع سونہ وار پہنچا۔ دل میں یہ وسوسہ ضرور تھا کہ کہیں عمر مجید نو آموز سمجھ کر دروازے سے ہی نہ لوٹا دے، لیکن اس کے برعکس انہوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ خاطر تواضع کی اور اگلی ملاقات میں اپنے کچھ افسانے ،سوانحی خاکہ اور ایک عدد فوٹو گراف دینے کا وعدہ بھی کیا۔یہ ملاقات میرے لئے حد سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔میں اپنے کام کو حتمی شکل دینے کے لئے پھر دیگر افسانہ نگاروں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جب میں نے کئی دنوں تک عمر مجید سے رابطہ نہیں کیا تو وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تفت روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' کے آفس تک پہنچ گئے۔انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگایا اور ساتھ میں ایک لفافہ بھی تھما دیا، جس میں کچھ افسانوں کے علاوہ مختصر سوانحی خاکہ اور ایک پرانی تصویر بھی تھی، جس کو دیکھ کر اخبار کے ایڈیٹر جاوید آذر نے عمر مجید پر فقرہ کستے ہوئے کہا کہ عمر صاحب کیا آپ بھی دوسرے ادیبوں کی طرح بڑھاپے میں جوانی کی فوٹو ساتھ رکھتے ہیں، یہ سنتے ہی عمر مجید زیر لب مسکرانے لگے۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے روز نامہ ''آفتاب'' کو خیر آباد کہہ کر ہفتہ روزہ ''رہبر'' کی ادارت سنبھالی ہے۔نور شاہ صاحب کے توسط سے ملنے کا پیغام بھیجا۔ایک دن میں ہفتہ روزہ ''رہبر'' کے آفس میں ملنے چلا گیا۔تنگ و تاریک سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بار بار مجھے یہ خیال ستارہا تھا کہ مجید صاحب ان ٹیڑھی میڑھی سیڑھوں کو کیسے طے کرتے ہوں گے۔عمر صاحب کمرے کے ایک کونے میں پروفیسر بدخشی صاحب کے ساتھ کسی معاملہ پر بحث کررہے تھے۔میں نے کھنکھارتے ہوئے اپنی آمد کی اطلاع دی تو مجھے دیکھ کر کرسی سے کھڑے ہوگئے اور بغلگیر ہوکر گویا ہوئے کہ آؤ برخوردار میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔تمہارے لئے ایک Assignment ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے ایک مضمون ''ریاست جموں وکشمیر کے ادیبوں کی کاوشیں..... ۲۰۰۶ء کے حوالے سے'' تحریر کرو۔میں نے مضمون لکھنے کی حامی بھرلی،لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اگر غیر دانستہ طور ہی سہی کسی کا نام چھوٹ جائے تو وہ غلطی قابل معافی نہیں بلکہ قابل گردن زدنی ہے۔یہ مضمون میں نے چار قسطوں میں لکھا،تو بہت خوش ہوئے۔اگر چہ ان کے ایک عزیز دوست نے مجھے ہدف تنقیص بناتے ہوئے ''ادبی ڈنڈھورچی'' کے خطاب سے بھی نوازا۔عمر مجید نے وہ مراسلہ مجھے تحفۂ عنایت کرکے فرمایا، برخوردار سنبھل کر لکھو کیونکہ تمہاری تحریر کسی بھی ادیب کی دل آزاری کا سبب بن سکتی ہے۔کچھ عرصہ کے بعد ہی عمر مجید کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔اگر چہ بعد میں خصوصی خطاب دینے والے ادیب سے میرے اچھے تعلقات استوار ہوگئے۔

عمر مجید سے جب بھی ملاقات ہوتی تو افسانوں کے حوالے سے ہی بات ہوتی۔وہ اس بات سے نالاں تھے کہ لوگ اب مطالعہ ومشاہدہ کے بغیر افسانے لکھتے ہیں۔ان کا یہ جملہ قابل توجہ ہوتا کہ برخوردار میں نے زندگی میں کل چالیس افسانے لکھے ہیں اور قہقہہ مار کر مزید کہتے کہ اس طرح میں نے سال میں ایک ہی افسانہ لکھا

ہے۔ مجھے منٹو کا وہ جملہ یاد آتا جس میں وہ بیدی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ''بیدی، تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔''

کئی دنوں کے بعد مجید صاحب لال چوک میں اضطراری عالم میں ملے۔ میں نے خیر و عافیت پوچھنے کے بعد پریشانی کا سبب پوچھا۔انہوں نے برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا کہ برخوردار تم نے دنیا میں مجھ سے زیادہ کم فہم آدمی دیکھا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے زندگی میں کل دو ناول لکھے ہیں جو بدقسمتی سے میرے پاس نہیں ہیں، میری خواہش تھی کہ ''درد کا دریا'' پھر سے شائع کروں، لیکن میرے پاس کوئی نسخہ موجود نہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ جناب آپ بے فکر رہیں کل تک آپ کو ناول مل جائے گا۔ میں گھر گیا اور ذاتی کتب خانے سے مذکورہ ناول ڈھونڈ کر عمر مجید کے دفتر ''آفتاب'' پہنچ گیا، کیونکہ انہوں نے پھر سے ''آفتاب'' جوائن کیا تھا، ناول کا نسخہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی کہ جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اچانک مل گئی ہو۔لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جب عمر مجید انتقال کر گئے، تو کوئی صاحب اسی ناول کے نسخے کو لے اُڑا۔ بعد میں عمر مجید کے فرزند سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس ناول کو چھاپنے کے لئے کسی کو دس ہزار کی رقم پیشگی بھی دی تھی۔ لیکن اُس پبلشر کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔

ایک دن مجید صاحب نے مجھے گھر پر ملنے کی تاکید کی۔ حسب سابق خاطر تواضع کرتے ہوئے کہا کہ برخوردار اب شاید زندگی وفا نہ کرے، تم یہ سارا مواد لے کر اس میں قابل اشاعت افسانے ترتیب دے کر ان کو ایک کتابی شکل دو۔ میں نے افسانوں کا یہ پلندہ بیگ میں رکھ کر کہا، جناب انتخاب میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اسی لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔

وقت گزرتا گیا اور میں گھریلو پریشانیوں میں اتنا الجھ گیا کہ عمر مجید کے افسانے سرسری مطالعہ کے بعد کتابوں کے ڈھیر کے نیچے دب گئے۔ کئی مہینوں کے بعد ایک دن عمر مجید نے فون پر گھر کا ایڈریس مانگا، میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے لاکھ جتن کئے کہ میں خود حاضر ہو جاؤں گا لیکن انہوں نے ایک نہیں مانی۔ مجھے مجبوراً ایڈریس دینا پڑا۔ قمرواری چوک میں ایک آدھ گھنٹا انتظار کے بعد جوں ہی مجید صاحب بس سے اترے۔ میں نے منت سماجت کی ایک کلومیٹر کا سفر آٹو میں طے کرتے ہیں، در جواب ہنستے ہوئے کہا کہ برخوردار میں نے پوری زندگی پہاڑوں کو سر کرتے ہوئے گزاری ہے اور تم مجھے بوڑھا سمجھ کر آٹو میں سفر کرنے کو کہتے ہو۔ گھر پہنچ کر میں نے ان کو افسانوں کا پلندہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کے افسانوں کو مرتب نہیں کر سکا۔ کوئی جواب دئے بغیر انہوں نے جلدی میں افسانوں کا پلندہ بغل میں دبائے گھر کی راہ لی۔ اگلے روز میں کشمیر عظمیٰ میں یہ اشتہار پڑھتا ہوں کہ عمر مجید کا افسانوی مجموعہ عنقریب شائع ہو رہا ہے، یہ عبارت پڑھ کر مجھے عجیب لگا کہ عمر مجید کو اتنی کیا جلدی پڑی ہے لیکن اس بات کا خلاصہ ایک مہینے میں ہی ہوا جب عمر مجید صاحب کا انتقال ہو گیا اور مجھے اپنی غیر سنجیدگی کا احساس ہوا۔



نوٹ: مجید صاحب کی تعزیت کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا کہ خاکسار ہی مرحوم کے افسانوں کو مرتب کریں۔ پھر میں نے افسانوں کی تلاش شروع کر دی اور ایک سال بعد عمر مجید کی پہلی برسی پر میری مرتب کردہ کتاب ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' شائع ہوئی۔

ہمیں نے تھی مانگی دعا برف کی

بچپن میں برف باری کے شروع ہوتے ہی گھر میں قید کیا جاتا تھا اور ان دنوں ہمارے ایک رشتہ دار نقاش انکل، جو فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد دو چیزوں میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ ایک تو وہ کشمیری نغمے بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے اور ساتھ ہی داستانوں کے بڑے رسیا تھے۔ ان کو طلسماتی دستانیں اتنی ازبر تھیں کہ وہ کہتے کہتے نہیں تھکتے تھے بلکہ قصہ در قصہ داستانوں کی طوالت کبھی کبھار ہفتوں تک پھیل جاتی تھی۔ ان کا اندازِ بیاں اتنا مسحور کن تھا کہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کرداروں کی سراپا نگاری اور واقعات کی منظر نگاری اتنی مہارت سے کرتے کہ پورا دن تصورات میں گزر جاتا۔ رستم سہراب، حاتم طائی، الف لیلیٰ اور کوہِ کاف کی پریوں کا تذکرہ کئی مہینوں تک چلتا رہتا۔

کسی نے شاید سچ کہا ہے کہ بچپن کی عادتیں نہیں چھوٹتیں۔ میری دلچسپی کب داستانوں سے افسانوں تک پہنچ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ میں اکثر و بیشتر اس تلاش میں رہتا کہ کوئی افسانوی مجموعہ پڑھنے کو ملے۔ اس لئے میں نے باضابطہ طور پر ڈسٹرکٹ لائبریری حبہ کدل سرینگر میں جانا شروع کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے ایک ساتھ ہزاروں کتابیں دیکھیں۔ اپنی پسند کی کتاب کھنگالتے ہوئے مجھے حکیم منظور کا ایک شعری مجموعہ ہاتھ لگا۔ کتاب کے کچھ اوراق الٹتے ہی مجھے ایک شعر نے اپنے جانب متوجہ کیا۔

کہانیاں جن کے خون میں ہوں، وہ بچے کیا میری سمجھیں
میں اس پری کو کہاں سے لاؤں کہ جو ابھی کوہِ قاف میں ہے

بس پھر کیا تھا میں نے حکیم منظور کی شاعری کو سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے مقامی شعراء پڑھنے کی تحریک ملی۔ طویل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حکیم منظور کئی طرح سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک بڑے شاعر میں جو خصوصیات ہونی چاہئے وہ سب حکیم صاحب کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنے وطن کے تئیں ایک سنجیدہ محبت ملتی ہے۔ انہوں نے عمداً ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جن کے مفاہیم کو زیادہ نزدیک سے صرف کشمیری ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے ایک سمینار میں سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے انہوں نے جذباتی ہو کر کہا کہ میں کشمیر کا نمائندہ بن کر ہر اس لفظ سے اکتسابِ فیض کرتا ہوں جو ہمارے روزمرہ کا حصہ ہے۔ ساتھ ہی انہوں کہا کہ جب میں کانگڑی کا تذکرہ کرتا ہوں تو مجھے ایک قسم کی حرارت ملتی ہے، پھرن صرف میرا تن نہیں ڈھانپتا بلکہ مجھے شرم وحیا سے بھی آشکار کرتا ہے، موسموں کی سازش سے اخروٹ کا لہولہان ہونا، سیب کی لالی سے خون کی مہک محسوس کرنا اور برف رتوں میں جھلسنا ہمارا نصیب ہو گیا۔ شاید یہی چیزیں میری شاعری کا محور و مقدر بن گئی ہے۔

تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے جانتا ہوں
لہو ہیں اخروٹ میرے موسموں کی سازشوں سے

حکیم منظور کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ناتمام (۱۹۷۷)، لہولمس چنار (۱۹۸۲)، برف رتوں کی آگ (۱۹۹۰)، خوشبو کا نام نیا (۱۹۹۱)، پھول، شفق آنگن کے (۱۹۹۳)، شعر آسمان (۱۹۹۷)، صبح، شفق، تلاوت

(۱۹۹۸)، برف آفتاب (۲۰۰۰) سخن برف زاد (۲۰۰۳)، قلم زبان شگاف (۲۰۰۵)، رباعی کا مجموعہ (چہار ضرب)۔اس کے علاوہ کشمیری میں دوشعری مجموعے اور ایک نثری کتاب ''اقبال ایک تذکرہ'' بھی شامل ہیں۔غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا کہ کتنا ہوگا۔

حکیم منظور کی شاعری کے بارے میں ناقدان فن نے سراہتے ہوئے صفحوں کے صفحے سیاہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔میں نے ان تاثرات سے مختصر ترین حصہ نکال کر سمندر کو ایک کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً راج نرائن رازؔ نے حکیم منظور کو صاحبِ اسلوب شاعر، ڈاکٹر عبدالغنی نے نادرو نایاب استعاروں کا خالق، زبیر رضوی نے منفرد لہجہ ساز شاعر، مخمور سعیدی نے وہبی شاعر، مجروح رشید نے مشاہدے کا عطر، رفیق رازؔ نے شعری وراثت کے امین، پروفیسر قدوس جاوید نے سخن ثقافت زاد، ڈاکٹر نکہت نظرؔ نے گم گشتہ صداؤں کا نقیب، شبیب رضوی نے سخن سنج وسخن فہم، عرش صہبائی نے مضمون آفرینی کے دلدادہ، ڈاکٹر مشعل سلطان پوری نے تراکیب سازی کا ماہر، ظریف احمد ظریف نے اپنی ذات میں انجمن، شاہد دلنوی نے بے ساختگی کے پیش رو، ڈاکٹر پریمی رومانی نے دورِ آشوب کا مرثیہ خواں قرار دیا ہے۔ایک بڑے شاعر کی پہچان یہی ہے کہ اس کے کلام میں مندرجہ بالا خصوصیات پائی جائیں۔اس طرح کے اکثر وبیشتر القاب حکیم منظور کو زندگی میں ہی نصیب ہوئے۔جبکہ ان کی وفات کے بعد ''شیرازہ اردو'' نے حکیم منظور نمبر شائع کیا۔حال ہی میں ڈاکٹر نکہت نظر کی کتاب ''ساتویں در کا شاعر ......حکیم منظور'' بھی منظر عام پر آگئی ہے، جو موصوفہ کا تحقیقی مقالہ ہے، جس کو حکیم منظور کی زندگی میں ہی تحریر کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکیم منظورؔ جیسے شاعر کو ہم لوگوں نے اس قدر

فراموش کردیا کہ ان کی برسی پر بھی کوئی انہیں یاد نہیں کرتا، کسی نے حکیم منظور کی شاعری کے حوالے سے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا، کسی نے ان کی کلیات بھی مرتب نہیں کی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم ہی لوگ رونا روتے ہیں کہ ہم نے آج تک کسی بڑے شاعر کو پیدا نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر حکیم منظور نے کسی اور جگہ جنم لیا ہوتا تو ان کی یاد میں کئی انجمنیں قائم ہوئی ہوتیں، کئی ایوارڈ دیے جاتے، کئی تنقیدی مقالے تحریر کئے گئے ہوتے اور کلیات تو کب کا چھپ چکا ہوتا۔ لیکن یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ اگر یہی روش بدستور قائم رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا بھی کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔

حکیم منظور جنہوں نے طویل علالت کے بعد ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء نئی دہلی میں وفات پائی۔ وفات سے قبل انھوں نے وصیت فرمائی کہ انہیں کشمیر میں ہی دفن کیا جائے۔ جب ان کے جسدِ خاکی کو ان کے آبائی مقبرہ واقع بہاؤالدین صاحب میں دفن کیا گیا تو اس وقت کشمیر میں برف باری ہو رہی تھی۔ حکیم صاحب برف رتوں کے شاعر تھے اور خود کو برف زاروں کی مملکت کا نمائندہ کہتے تھے۔ اسی لئے شاید ان کی قبر کے اندر بھی برف کی سفید چادر بچھ گئی، جس کا اشارہ انہوں نے پہلے ہی دیا تھا۔

چھپا کے خود کو کہیں رکھ نہ پائے گی خوشبو
کہ برف جب بھی گرے مجھ تک آئے گی خوشبو

......●......

دکن کی شمع سے روشن ہے وادیٔ کشمیر

''مصنف نے کہانی لکھی۔

کاتب نے کتابت کی۔

اور نہ صرف ترتیب میں اس کا نام آیا بلکہ اسی کہانی کا عنوان کتاب کا نام بھی قرار پایا۔۔

لیکن!۔۔۔جب کتاب پریس کو جارہی تھی، تو کہا گیا۔

خبردار! جو یہ کہانی شائع ہوئی!

آخری الفاظ مصنف کے اپنے ہی الفاظ تھے''۔

یہ چند جملے ریاست کے معروف افسانہ نگار پروفیسر مخمور حسین بدخشی کے افسانوی مجموعے ''نیل کنول مسکائے'' کے آخر پر درج ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس کہانی پر افسانوی مجموعے کا عنوان رکھا گیا اور وہی کہانی مجموعے میں ندارد۔ شاید یہ اردو ادب میں پہلی بار ہوا ہوگا۔ میں نے بارہا پروفیسر موصوف سے اس بارے میں جانکاری چاہی لیکن انہوں نے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا بلکہ اپنی شگفتہ اور مزاحیہ گفتگو سے اس کے محرکات پر خوبصورتی سے پردہ ڈالتے رہے۔ بہر حال جو بھی محرکات اس کے پیچھے رہے ہوں لیکن یہ بات دلچسپی کی باعث ضرور ہے کہ مجموعے کا عنوان ایسی کہانی پر رکھا گیا ہے جو اس مجموعے میں شامل نہیں۔ ویسے بدخشی صاحب

کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کو دیکھ کر ایسے کارنامے ہونا بعید از قیاس نہیں۔ بدخشی صاحب کا یہ افسانوی مجموعہ اردو کے معروف ومشہور محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر محی الدین قادری زور نے اپنے ادارہ ''ادارہ ادبیات اردو'' حیدر آباد سے شائع کرایا تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بدخشی صاحب ان دنوں ایم،اے کے طالب علم تھے اور پروفیسر موصوف کی دریادلی اور نوآموز کے تیئں حوصلہ افزائی کا عالم دیکھیں کہ انہوں نے کتاب کا دیباچہ لکھنے، کاغذ خریدنے، پُروف پڑھنے اور پھر کتاب چھپ جانے کے بعد اس کی فروخت اور اس پر تبصرے چھاپنے کے ہر مرحلہ پر خود نگرانی کی۔ زور صاحب کتاب میں شامل پیش لفظ میں بدخشی صاحب کی افسانہ نگاری کے متعلق یوں لکھا ہے:۔

''مخمور حسین کے افسانے پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بہت رواں لکھتے ہیں اور ہر موضوع پر افسانوی انداز میں انشاء پردازی کرتے ہیں۔ میں نے ان سے خواہش کی کہ اپنے افسانے مجھے دکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے افسانے لادئے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ انکی گفتگو اور اندازِ طبیعت کے خلاف انکے افسانوں میں مسکراہٹیں کم اور طنز کاری زیادہ ہے۔ انہوں نے ہنستے چہروں سے زیادہ افسردہ دلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکاروں پر بھرپور طنز کرنے کی کوشش کی ہے''۔

زور صاحب نے حوصلہ افزائی کی اس روایت کو بدخشی صاحب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے قاضی غلام محمد کے شعری مجموعہ ''حرف شیریں'' اور حامدی کاشمیری کی تنقیدی کتاب ''ناصر کاظمی کی شاعری'' کو بھی ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد سے شائع کرایا۔ انہوں نے کشمیر میں رہ کر قلیل مدت میں ہی یہاں کے لوگوں کے دل جیت لئے۔

زور صاحب نے کشمیر میں آتے ہی یہاں کی تاریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ ہمیشہ تاریخی مقامات کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ مزارِ شہدا کی خاک چھانتے

رہتے جیسے کسی گمشدہ چیز کی تلاش ہو۔ کشمیر کی کلاسیکل شاعری کے اتنے دلدادہ تھے کہ یہاں کے قدیم ادباء، شعراء اور مورخوں کے کارناموں کو اُجاگر کرنے لئے "داستان ادب کشمیر" کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا بیڑا بھی اُٹھایا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کافی مواد بھی جمع کیا تھا۔ ان کے دل میں کشمیری زبان سیکھنے کا شوق بھی تھا۔ چناچہ اپنے مکان کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بچیوں اور بچوں کو جمع کر کے انہیں کشمیری میں بولنے کو کہتے اور مٹھائی بانٹ کر ان کی حرکات وسکنات سے محظوظ ہوتے تھے۔ انہوں نے کشمیری کے کئی فقرے سیکھ بھی لئے تھے۔ اہل کشمیر کی فنی اور عملی صلاحیتیوں کی داد دیتے رہتے تھے۔

جب زور صاحب کا آخری وقت آیا تو ان کے چاہنے والوں کا تانتا باندھا رہا۔ ہر شخص کی آنکھیں نم تھیں، ہر کوئی اس بات سے بے خبر کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ زور صاحب کا خلوص ہر دل میں اتنی جگہ بنا چکا تھا کہ جیسے زور صاحب حیدر آباد کے نہیں بلکہ کشمیر کے آبائی باشندہ تھے۔ کشمیر کے معروف محقق محمد یوسف ٹینگ زور صاحب کے جنازے کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

"۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات کو سرینگر کی ادب نواز آغوش میں زور صاحب ابدی نیند سو گئے۔ جس وقت ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک طرف خالد کشمیر (بخشی غلام محمد) اور ان کی کابینہ کے وزراء، اعلیٰ حکام، یونیورسٹی کے وائس چانسلر سردار پانیکر اور دیگر اساتذہ اور دوسری طرف ادیبوں، شاعروں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں نفوس کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں، جیسے اس انبوہِ کشمیر کا کوئی محبوب چھن گیا ہو۔ تلسی باغ (سرینگر) میں ان کی قیام گاہ سے لے کر خانیار شریف میں ان کی آخری آرام گاہ تک یہ مجمع بڑھتا ہی گیا۔"

ڈاکٹر زور کی آخری آرام گاہ پائینِ شہر کے ایک پرانے محلے خانیار میں زیارت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ جسکو عرفِ عام میں زیارتِ پیر دستگیر صاحب کہتے ہیں، کے صحن میں واقع ہے جہاں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں فرزندانِ توحید حاضری دیتے ہیں۔ اس زیارت شریف کے عقب میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر اس عاشقِ اردو کی لوحِ مزار پر پڑتی ہے......!!

دکن کے لوگوں کو یہ گلا ہے کہ زور صاحب کو کشمیر کی مٹی اتنی راس آگئی کہ انہوں نے ابدی آرام کے لئے یہاں کی زمین کو ہی منتخب کیا۔ لیکن قانونِ قدرت کو کون ٹال سکتا ہے کہ انسان جس مٹی سے تخلیق ہوتا ہے اس کو وہی سپرد خاک کیا جاتا ہے۔ آخر پر دکن کی معروف شاعرہ بانو طاہر سعید کا ملال بھرا قطعہ ملاحظہ فرمائیں۔

اے ارضِ کاشمیر یہ کیسا ستم کیا
ہیرا دکن کا چھین کے پہلو میں رکھ لیا
ہم رو رہے ہیں خون کے آنسو خبر بھی ہے
تو خوش ہے کہ ”کوہِ نور“ ہمارا تجھے ملا

......●......

سرسری تم جہان سے گزرے

ہمارے فسٹ ایئر کے نصاب میں شامل اختر محی الدین کی مشہور کہانی ''دند وَزُن'' آج بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں گھونج رہی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے جن کو ہم عرفِ عام میں ''واتل' (موچی) طبقہ کہتے ہیں۔ افسانہ کے مکالمے برجستہ، کردار چست اور پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ اس افسانے کی بدولت ہی مجھے اختر محی الدین کے دوسرے افسانے پڑھنے کا اشتیاق بڑھا اور تلاشِ بسیار کے بعد اختر محی الدین کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ست سنگر'' دستیاب ہوا، جو آج بھی میرے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ مجھے اتنا عزیز تھا کہ میں اس کو سرہانے رکھا کرتا تھا، جس سے میں کشمیری میں افسانے لکھنے کی طرف راغب ہوا اور میں نے ''خواب چھا کنہ حقیقت'' کے عنوان سے ایک افسانہ تحریر کیا۔ جب میں نے یہ افسانہ ریڈیو کشمیر یووانی سروس کے انچارج کو سنایا، تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر confuse کر دیا کہ اس میں پلاٹ ہی نہیں ہے۔ ''پلاٹ'' لفظ سن کر میں چونک پڑا، کیونکہ یہ لفظ میں پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ انچارج پروگرام سے استفسار کیا، کہ پلاٹ کس کو کہتے ہیں۔ میرے اچانک سوال کرنے پر وہ تلملا اٹھے اور یہ کہہ کر وہاں سے رخصت کیا کہ ابھی تمہاری عمر افسانے

لکھنے کی نہیں ہے۔میں حیران و پریشان یہ نہیں سمجھ پایا کہ ''پلاٹ'' کس کو کہتے ہیں اور افسانے میں پلاٹ کی کیا اہمیت ہے۔گھر پہنچ کر پھر سے اختر محی الدین کے افسانے پڑھنے شروع کیے،لیکن پلاٹ کا معاملہ پھر بھی جوں کا توں رہا۔برسوں بعد جب میرا داخلہ شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی میں ہوا تو مرحوم پروفیسر مجید مضمرؔ ''افسانہ'' کا پرچہ پڑھانے لگے۔میں نے پہلے ہی یہ سوچ رکھا تھا کہ آج میں پروفیسر صاحب سے ''پلاٹ'' کے بارے میں پوچھوں گا۔مجھے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔جب انہوں نے پہلے ہی لیکچر میں ''پلاٹ'' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ واقعات کی چھوٹی چھوٹی کڑیوں کو جوڑ کر پلاٹ بنتا ہے۔جوں ہی میں نے پلاٹ کی یہ تعریف سنی، مجھے اپنی نادانی پر ہنسی آئی کہ میں نے خواہ مخواہ ''پلاٹ'' لفظ پر اتنا وقت ضائع کردیا اور آج اتنے برسوں کے بعد مجھے اپنی وہ کہانی یاد آرہی ہے جس کو ایک شخص نے لاعلمی کی بنیاد پر رد کردیا تھا۔جبکہ کہانی میں پلاٹ بدرجہ اتم موجود تھا۔اس طرح کے معاملات اکثر نو واردانِ ادب کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں ریاست کے کہنہ مشق شاعر ہمدمؔ کاشمیری نے مجھے ایک کتابچہ یہ کہہ کر عنایت کیا کہ برخوردار میں نے یہ تحفہ صرف تمہارے لئے لایا ہے۔جب میں نے کتابچہ کے ٹائل ورق پر نظر دوڑائی تو ''افسانے کے قواعد'' کا عنوان دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔کیونکہ اصل میں یہ ایک طویل مضمون ہے جس کو سکندر احمد نے ''شب خون'' میں چھاپا تھا۔یہ مضمون افسانے کی ساخت اور ہیئت کے تعین کرنے میں کئی اعتبار سے کنٹرورشل بھی بنا تھا۔کتابچہ کا پیش لفظ اشعر نجمی نے تحریر کرتے ہوئے افسانے کے بارے میں کچھ سوالات قائم کئے ہیں جن کے بارے میں ایک افسانہ نگار کو کما حقہ معلومات ہونی چاہیئے۔

''افسانے کے حدود کیا ہیں؟ اچھے اور بُرے افسانے کی کیا پہچان

ہے؟ افسانے میں اظہار کے کتنے وسائل ہیں اور مزید کتنے امکانات ہیں؟ کیا افسانہ محض کسی واقعے کا صحافتی اظہار ہے یا افسانہ نقلِ واقعہ ہے یا من گھڑت کا عمل؟ افسانے کی بنیادی اکائی استعارہ، علامت یا تمثیل ہے یا واقعہ، زمانہ اور زبان ہے؟ داستان اور جدید فکشن میں کیا فرق ہے؟ افسانہ بنتا کیسے ہے؟ کوئی بیانیہ معنی خیز کس طرح ہوتا ہے؟ فکشن اور شاعری کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے والے عناصر کون سے ہیں؟ بیانیہ کی کتنی قسمیں ہیں؟ افسانے کے مصنّف، اس کے راوی اور مخفی مصنّف میں کیا فرق ہے؟ افسانے میں واقعہ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ واقعات کتنے طرح کے ممکن ہیں؟ پلاٹ کی تعریف کیا ہے اور کیا اس کی روایتی تعریف کے علاوہ کوئی اور تعریف بھی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ سوال اور بھی بہت ہیں جن پر اب کھل کر بحث ہونی باقی ہے۔ اس ضمن میں ممتاز شریں کا نام نہایت ہی اہم ہے جنہوں نے ''تکنیک کا تنوع'' جیسا معرکتہ الآرا مضمون لکھا، جس میں پہلی مرتبہ افسانے کے فارم اور تکنیک کے فنی نکات زیرِ بحث آئے۔ انہوں نے افسانے کے تشکیلی عناصر کی واضح نشان دہی کردی مثلاً افسانے میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، بیانیے کا اظہار اور وقت و ماحول کی وابستگی وغیرہ کی ماہیت کیا ہے اور کس طرح افسانے کی بُنت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک افسانہ نگار ان مقامات سے کیوں کر نبرد آزما ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔''

سکندر احمد نے اپنے طویل مضمون ''افسانے کے قواعد'' میں مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مثالوں سے افسانے کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور افسانے کی تعبیر و

تشریح کی وضاحت کرتے ہوئے کچھ نکات کی نشاندہی یوں کی ہے:

بیانیہ: کہانی، پلاٹ

کردار: مرکزی کردار، ذیلی کرداراور سرسری کرداروغیرہ

تھیم: افسانے میں پوشیدہ سچائی

گردوپیش: افسانہ کا وہ حصہ جس کے بغیر بھی کہانی آگے بڑھ سکے

نکتۂ نظر: افسانے کا تناظر

بیان کنندہ: کہانی کون بیان کرر ہاہے، مصنّف خود یا افسانے کا کوئی کردار

علامت: تجریداور تمثیل کا استعمال اور درج بالاعناصر کو سمیٹنے کا اسلوب

غرض یہ سب لوازمات، جوایک کہانی کی بنت میں اہم ہیں اور ہماری زندگی سے جڑے ہر پہلو میں پنہاں ہوتے ہیں۔اسی لئے شیکسپیر نے دنیا کوایک سٹیج قرار دیا ہےاور دنیا میں ہر آنے والا شخص اپنا کردار نبھاتا ہے۔اگر بغور دیکھا جائے تو سینکڑوں کہانیاں ہمارے روزمرّہ کا حصہ بنتی ہیں بشرط یہ کہ دنیا کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ بقول میر تقی میرؔ

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

......●......

میرا ماضی مجھے یادوں کے فسانے دے گا

کالج کے دنوں میں نسیم حجازی اور صادق سردھنوی کے نام زبان زدہ خاص وعام ہوا کرتے تھے۔ اپنے سینئرز سے متاثر ہو کر میں نے بھی تاریخی ناولوں کا مطالعہ شروع کیا۔ ناول پڑھنے کا چسکا اس قدر لگ چکا تھا کہ نصابی کتابوں میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ جوڑنے کی کوشش میں کچھ نثری نظمیں تخلیق کیں۔ لیکن مذاق کا نشانہ بننے کے خوف سے کسی کو دکھانے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔ اس لئے خاموشی سے لکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک ڈائری مکمل ہوگئی۔ جب میرے ایک استاد کو یہ معلوم ہوا کہ مجھے شاعری کا چسکا لگ چکا ہے تو انہوں نے مجھے ذاتی لائبریری سے کئی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ جن میں بنگلور کے ایک شاعر سلیم زاہدؔ کا شعری مجموعہ بھی تھا۔ جوں ہی میں نے کتاب کا سرسری مطالعہ شروع کیا، تو مجھے کئی اشعار اچھے لگے۔ میں نے جسارت کر کے اپنے تاثرات ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر سلیم زاہدؔ کو ارسال کیا۔ قریباً ایک مہینے کے بعد سلیم زاہدؔ کا جوابی لفافہ ملا۔ جس میں انہوں نے بڑی حوصلہ افزا باتیں لکھیں تھیں۔ جن سے مجھ میں اتنی ہمت بندھی کہ میں نے کچھ نثری نظمیں زاہدؔ صاحب کو اصلاح کے لئے روانہ کیں۔ انہوں نے نظموں کی نوک پلک ہی نہیں سنواری بلکہ کچھ مفید

مشورے بھی عنایت کیئے۔اس طرح یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ایک دن انہوں نے فون پر اطلاع دی کہ میں ریڈیو کشمیر کے مشاعرے کے سلسلے میں کشمیر آرہا ہوں ۔امید ہے کہ آپ میزبانی کے شرف سے ضرور نوازیں گے۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جب مجھے زندگی میں پہلی بار ائیر پورٹ دیکھنے کا موقعہ ملا۔گھر سے ہی ایک بڑے سائز کا کارڈ بنایا اور اس پر فلمی انداز میں جلی حروف سے سلیم زاہد (بنگلور) لکھا۔میں اس شخص کو لینے جارہا تھا جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔اس لئے یہ خدشہ ضرور تھا کہ میں زاہد صاحب کو کیسے پہچانوں گا۔جوں ہی میں ائیر پورٹ کے اندر داخل ہوا،تو پتہ چلا کہ جہاز late ہے۔انتظار کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے کیفٹریا کا رخ کیا۔وہاں ایک کونے میں رفیق راز اور معروف گلوکار غلام نبی شیخ پہلے ہی موجود تھے۔مجھے انداز ہ ہوا کہ یہ شعراء کو Receive کرنے آئے ہوں گے۔یہ وہی غلام نبی شیخ تھے جن کا دوران سفر ریل گاڑی میں قتل کیا گیا تھا۔اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔(آمین) مرحوم شیخ صاحب نے مجھے اپنی طرف آتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں نے راز صاحب سے شعراء کے متعلق دریافت کیا اور ساتھ ہی سلیم زاہد کو نہ پہچانے کی بات بھی کی۔مرحوم شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا برخوداراس میں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔تم اس کارڈ کو بیگ میں ڈال دو۔میں تمہاری اس پریشانی کا حل ڈھونڈ کر لاتا ہوں،فی الحال تم راز صاحب کے ساتھ چائے نوش کرو۔یہ کہتے ہوئے وہ جہاز کے متعلق دریافت کرنے چلے گئے۔

رفیق راز صاحب سے بالمشافہ ملاقات پہلی بار ہورہی تھی۔اگر چہ میں ان کی مسحور کن آواز ریڈیو پر بچپن سے سنتا آرہا تھا۔ان دنوں راز صاحب کی غزلیں ''شب خون'' کے شماروں میں خوب چھپتی تھیں۔یہاں تک کہ ان کو جدیدیت کے

نمائندہ شعراء میں شمار کیا جاتا تھا۔ موقعہ غنیمت جان کر ''شب خون'' اور ''جدیدیت'' کا موضوع چھیڑا۔ بس پھر کیا تھا راز صاحب اپنے مخصوص انداز میں جدیدیت کی پیچیدگیوں کو سلجھانے لگے۔ جیسے ایک استاد اس بات پر بضد ہوں کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل برحق ہے۔ راز صاحب یہاں تک جذباتی ہو گئے کہ انہوں نے شمس الرحمان فاروقی کو اردو کا واحد نقاد گردانا۔ ان کی بصیرت آموز گفتگو سن کر مجھے جدیدیت کی اصطلاح بہت بھلی لگی اگر چہ ان دنوں ہر طرف جدیدیت کے خلاف بولا اور لکھا جا رہا تھا۔ ابھی ہماری گفتگو کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچی تھی کہ مرحوم شیخ صاحب نے ہمیں جہاز کی آواز کی طرف متوجہ کیا۔ لوگ خراماں خراماں جہاز سے اتر رہے تھے اور ہم اپنے مہمانوں کی طرف متوجہ تھے کہ کب وہ باہر آئیں۔ قریباً سب لوگ جہاز سے اتر چکے تھے لیکن شعرائے کرام کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ابھی چند منٹ کا وقفہ ہی ہوا کہ دور سے چند شعراء اپنے اپنے بیگ سنبھالے چلے آرہے تھے۔ میں سلیم زاہد کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ راز صاحب نے میری الجھن سمجھتے ہوئے شعراء سے سلیم زاہد کے متعلق دریافت کرنے لگے لیکن بدقسمتی سے سلیم زاہد نہیں آپائے تھے ، جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس واقعے کے ایک مہینے بعد مجھے سلیم زاہد کی بہن سے ایک مکتوب موصول ہوا، جس کو پڑھ کر سلیم زاہد کے کشمیر نہ آنے کی وجہ دریافت ہوئی۔ آج دس سال بعد کاغذ کے پلندوں سے وہ خط نکل آیا جس سے مجھے شدید بے چینی کا شکار ہونا پڑا تھا۔

از بنگلور

۳۰ ستمبر ۲۰۰۰

بھائی جان، اسلام علیکم

تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی، معاف

کریں۔ یہ خط سلیم زاہد نہیں بلکہ ان کی طرف سے ان کی بہن لکھ رہی ہوں۔ جس دن آپ کا خط ملا، وہ بیمار ہسپتال میں تھے۔ Diabetes کی وجہ سے دونوں کڈنی (Kidney fail) ہوگئے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں اسٹروک بھی ہوگیا۔ اس کی وجہ سے وہ قلم بھی سیدھا نہیں پکڑ پاتے تھے۔ جب گھر آئے تو انہوں نے آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ظاہر کی۔ کئی بار آپ کے خط کا جواب لکھنے کی کوشش کی۔ پر وہ ٹھیک سے نہ لکھ پاتے۔ Dialysis کرتے رہے۔ اچانک بخار کی وجہ سے Manipal Hospital میں ایڈمٹ ہوکر آٹھ دن رہے اور ۲۵ جولائی ۲۰۰۰ کو وہ انتقال کرگئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت نصیب کرے۔ آپ بھی ان کی مغفرت کے لئے دعا کریں۔

دعا گو

آپ کی بہن

حامدہ مشتاق

......●......

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے

۲۷ جون ۲۰۱۱ء کی بات ہے، میں مرحوم بشیر شاہ کی عیادت کے لئے ہسپتال گیا۔ وہاں میں نے انہیں اچھی حالت میں نہیں پایا جوں ہی میں نے سرہانے بیٹھ کر صحت کے متعلق رسمی طور پر پوچھا تو انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ سالک مجھے اب مرنے کا کوئی غم نہیں، کیونکہ میری کتاب چھپ کر آ گئی ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری کتاب کی رسم رونمائی میری غیر حاضری میں ریڈیو کشمیر میں ہوئی جہاں میں نے زندگی کے تیس سال گزارے ہیں۔ میں حیران و ششدر کہ بشیر شاہ موت کی دہلیز پر ہونے کے باوجود اس لئے خوش ہیں کہ ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ تکیہ کے سرہانے ایک کتاب نکال کر کپکپاہٹ کے باوجود اس پر میرا نام لکھ کر مجھ سے گویا ہوئے کہ تم اس پر تبصرہ ضرور کرنا، مجھے انتظار رہیگا۔ میں نے افسانوی مجموعہ ان سے لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ بشیر شاہ اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔

بشیر شاہ کا تعلق اس خانوادے سے تھا جہاں ایک نہیں بلکہ تین افسانہ نگار ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے۔ محی الدین شاہ، نور شاہ اور بشیر شاہ۔ محی الدین شاہ نے ظفر احمد کے ساتھ ''پھول اور آویزے'' کے عنوان سے افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ نور شاہ

محتاج تعارف نہیں، ان کی پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اب بشیر شاہ کا بھی ایک افسانوی مجموعہ ''شب کے سمندر میں'' شائع ہو چکا ہے۔

کئی سال پہلے بشیر شاہ کا انگریزی کالم ''میڈیا واچ'' گریٹر کشمیر میں ہر ہفتے پڑھنے کو ملتا تھا۔ یہ مرحوم نور محمد بٹ کے ''کلچرل نوٹس'' کے بعد اپنی نوعیت کا منفرد کالم تھا جس میں مقامی سطح پر ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا تھا۔اس کالم میں بشیر شاہ کی معلومات اور اصطلاحات کا خوب چرچہ ہوتا اور ساتھ ہی ان کے تجزیاتی مطالعے سے نئے نئے گوشے سامنے آتے۔ میری دیرینہ خواہش رہی کہ کاش اردو میں بھی اس نوعیت کا کوئی کالم لکھا جاتا۔

بشیر شاہ سے میری پہلی ادھوری ملاقات فون پر ہوئی تھی۔ جب انہوں نے میرے ایک کالم کو پڑھ کر مجھے بتایا کہ برخوردار تم نے حکیم منظور پر لکھ کر اچھا کام کیا ہے۔اب کسی دن میرے دوست شجاع سلطانؔ کے بارے میں بھی کچھ ضرور لکھنا کیونکہ یہاں کے نقادوں نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی کہ میرا لکھا ہوا کالم شاہ صاحب کو بہت پسند آیا تھا۔میں نے حوصلہ پا کر کہا کہ شجاع سلطانؔ کا شعری مجموعہ کہاں ملے گا، انہوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے ہمیشہ تساہل پسندی سے کام لیا، اسی لئے ابھی تک شجاع کا کلام مرتب نہیں ہوسکا۔ یہ کہہ کر انہوں نے فون کاٹ لیا جیسے میں نے ان کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ لیا ہو۔پھر ایک دو مہینے گزرنے کے بعد نور شاہ صاحب کے یہاں جانا ہوا۔وہاں پتا چلا کہ بشیر شاہ، نور شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں اور اسی علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور نور شاہ صاحب سے گزارش کی وہ میری ملاقات بشیر شاہ سے کروائیں۔اس طرح میں پہلی بار بشیر شاہ مرحوم سے ملاقی ہوا۔باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے تیس سال ریڈیو میں ملازمت کی ہے اور عمر بھر ریڈیو کے

لئے لکھتے رہے۔ اپنے گلے کی دائمی تکلیف کی وجہ سے انہوں نے ریڈیو پر اپنی آواز کا مظاہرہ نہیں کیا مگر لکھنے کی وابستگی آخری دم تک برقرار رہی۔ میں نے جب شجاع سلطان کا ذکر چھیڑا، تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ کاش شجاؔع نے اپنا شعری مجموعہ مرنے سے پہلے ہی شائع کیا ہوتا۔ انہوں نے مجھے کاغذ کا پلندہ دکھاتے ہوئے کہا کہ میں نے اب ذاتی کوشش سے شجاؔع کی اہلیہ کو اس کام کے لئے آمادہ کیا ہے اور ساتھ ہی شجاع کی شاعری پر زبیر رضوی سے ایک تنقیدی مقالہ بھی لکھوایا ہے اگر اللہ نے چاہا تو میں بھی اپنے تاثرات ضرور لکھوں گا۔ اس مختصر ملاقات میں شعروادب کے علاوہ مصوری پر بھی بات ہوئی۔ خصوصاً غلام رسول سنتوش اور شجاع سلطان زیر بحث رہے۔

پھر جب بھی ملاقات ہوتی تو اردو افسانوں کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ میں ایک افسانوی انتھالوجی مرتب کر رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اپنا ایک افسانہ عنایت کریں۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ میں کونسا بڑا افسانہ نگار ہوں جو تم میرا افسانہ شامل انتخاب کروں گے۔ میں نے پوری زندگی میں کل بیس افسانے لکھے ہیں کیونکہ افسانہ لکھنا بہت مشکل ہے اور میں حیران ہوں کہ لوگ ایک سال میں ایک افسانوی مجموعہ کیسے شائع کرتے ہیں۔ ساتھ ہی جذباتی ہوتے ہوئے اس بات کی وکالت بھی کی کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ لوگوں کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ ''وار اینڈ پیس'' اور'' آگ کا دریا'' جیسی ضخیم کتابیں پڑھیں؟...... وقت بند مٹھی کے پانی کی طرح ہے جو انگلیوں کی پوروں سے خاموش اور بے آواز سرکتا ہے۔ ایسے میں وقت کے متوازی قدم سے قدم ملا کر چلنا غالباً انسان کے اختیار میں بھی نہیں؟ چنانچہ long narratives یا بیانیہ کا چلن رفتہ رفتہ از خود کم ہوتا جا رہا ہے۔ میں شاہ صاحب کی ایک ایک بات پر غور کر رہا تھا کہ انہوں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کچھ اہم نکتوں کی طرف نشاندہی کی کہ بعض اصحابِ فکر کا

یہاں تک کہنا ہے کہ الیکٹرانک انقلاب کے اس دور میں کتاب کی اہمیت یا دوسرے معنوں میں چھپے ہوئے لفظ کی ضرورت اور افادیت ہر آنے والے دن کے ساتھ گھٹتی چلی جائیگی۔ بات بحث طلب سہی لیکن سوچ وفکر کے دروازوں پر گاہے گاہے دستک ضرور دے جاتی ہے؟...... میں نے موضوعِ گفتگو کی نوعیت بدلنے کے لئے کہا کہ آپ کا افسانوں کے حوالے سے کیا نظریہ ہے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جہاں تک میرے افسانوں کی بات ہے تو میرے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ادب میں نیا پرانا کچھ نہیں ہوتا، کسی بھی تخلیق میں، تخلیق کار کی دین، بس یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں Treatment کے تئیں کتنا پختہ یا ناپختہ ہے۔ تکنیک کی باریکیوں سے کس حد تک واقف ہے؟ افسانہ نگار اگر ایک ڈھب سے، ایک ڈھنگ سے یا یوں کہیے کہ فنکاری سے بات کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے تو تخلیق از خود ایک نیا لباس زیب تن کر کے سامنے آجاتی ہے اور دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

شاہ صاحب ۲۹ جون ۲۰۱۱ء کو انتقال کر گئے۔ ایک سال بعد جب میں ان باتوں پر غور کرتا ہوں تو یقیناً ایک نئی دنیا سے متعارف ہوتا ہوں اور دل میں یہ کسک رہتی ہے کہ میں نے مرحوم بشیر شاہ کی کتاب پر تبصرہ کیوں نہیں لکھا۔ شاید یہ کام میرے بس کا نہیں تھا۔

......●......

تیرے بدلے جوشؔ مرنے کے لئے تیار ہے

میرے والد صاحب اکثر اقبال کو ''یقبال'' اور خانیار کو '' ہانیار'' کہتے ہیں۔ میں نے بارہا ان کو ٹوکا پھر بھی ان کا تلفظ صحیح نہیں ہوا۔ یہ معاملہ اکثر ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو شہرِ خاص میں رہتے ہیں۔ اس بات میں دورائے نہیں کہ علامہ اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں کے ساتھ نہایت عقیدت تھی لیکن کشمیر کے لوگوں نے بھی علامہ کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اسکولوں، دوکانوں، ہاوس بوٹوں، ہوٹلوں، پارکوں، کالونیوں وغیرہ کو علامہ اقبالؔ سے منسوب کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ جن میں اقبال مموریل انسٹی ٹیوٹ، اقبال پارک، اقبال آباد، اقبال ٹرسٹ، اقبال اکادمی، اقبال لائبریری اور اقبال کالونی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مرحوم پروفیسر حیدری نے اپنا رسالہ ہی اقبالؔ کے نام منسوب کر کے ''حکیم الامت'' جاری کیا، جو آج بھی بڑی آب وتاب سے نکل رہا ہے۔ بڑے لوگوں کی یہ بھی ایک نشانی ہوتی ہے کہ زمانے کے تغیر وتبدل کے باوجود ان کے اسمائے گرامی زبان زد خاص وعام ہوتے ہیں۔ اگر کشمیریوں کے بس میں ہوتا تو وہ بزبان جوش ملیح آبادی اس طرح گویا ہوتے:

واپس آ، اقبالؔ تجھ بن دہر تنگ و تار ہے
تیرے بدلے جوشؔ مرنے کے لئے تیار ہے

علامہ اقبالؒ برصغیر کی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں، جن کی تحریروں میں فکر و فلسفہ کے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ علامہ کو کشمیر الاصل ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کشمیر کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ جب بھی ان کی خدمت میں کوئی کشمیری حاضر ہوتا تو وہ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو جاتے اور اپنے وطنِ مالوف سے آئے ہوئے مہمان کی خاطر مدارات میں ہمہ تن گوش مصروف ہو جاتے۔ جون ۱۹۲۱ء میں وہ پہلی بار اور آخری بار کشمیر آئے۔ کشمیر کے رئیس شیخ محمد بخش نے انہیں دیوانی مقدمے کی پیروی کے لئے بلایا تھا، تو علامہ اقبال نے مولوی احمد دین وکیل اور منشی طاہر دین کو اپنے ہمراہ ساتھ لیا تھا، جس مقدمے کی پیروی کے لئے علامہ آئے تھے اس کا فیصلہ حسبِ منشا نہیں ہوا تھا۔ اصل میں علامہ کو ''رحمان نامی'' سری نگر کے باشندے کے خلاف قتل کے مقدمہ کی وکالت کے لئے منتخب کیا گیا تھا لیکن علامہ کی بحث سے وہ پھانسی کی سزا سے تو بچ گیا لیکن عمر قید ہو گئی۔ اس مقدمہ کا فیصلہ جسٹس کنور سین ایم اے (جو لاہور کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے) نے دیا تھا۔ علامہ نے یہاں قریباً دو ہفتہ قیام کیا۔ ان دو ہفتوں میں علامہ نے ڈل، نشاط اور شالیمار باغ میں زیادہ وقت گزارا۔ پیامِ مشرق کی نظم ''ساقی نامہ'' نشاط باغ میں تخلیق کی۔ وہ کشمیر کے ناگفتہ بہ حالات دیکھ کر کافی رنجیدہ ہوئے، کیونکہ کشمیر مطلق العنان شخصی حکمرانوں کے تلے کراہ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جا بجا مظلوم کشمیریوں کی حالتِ زار کی عکاسی کی ہے۔ علامہ کے شعری مجموعوں میں خصوصاً پیامِ مشرق، ارمغانِ حجاز، زبورِ عجم، جاوید نامہ میں بیش تر ایسے اشعار ہیں جن میں کشمیریوں کی کسمپرسی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ علامہ کے سینکڑوں خطوط ایسے ہیں جن میں انہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کے بارے میں کشمیری مشاہیر اور خیر خواہانِ کشمیر کو لکھا ہے۔ علامہ کو جن کشمیری مشاہیر کے ساتھ خط و کتابت رہی ان میں منشی محمد دین فوق، مولانا انور شاہ کاشمیری، میر خورشید احمد، شیخ محمد عبداللہ، عبدالصمد

نگرومقبل، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، پیرزادہ غلام احمد مہجوؔر اور منشی سراج الدین قابل ذکر ہیں۔

غلام نبی خیالؔ نے ''ادبی دنیا'' کے اپریل کے شمارے میں محمد عبداللہ قریشی کے شائع شدہ مضمون کے حوالے سے اپنی کتاب ''اقبال اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر'' میں مہاراجہ پرتاب سنگھ اور علامہ اقبالؔ کے درمیان ہوئی ایک ملاقات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

مہاراجہ پرتاب سنگھ کشمیر ہاؤس لاہور میں ٹھہرے تھے۔ڈاکٹر صاحب کا مہاراجہ سے تعارف کرایا گیا۔بعض دوستوں نے اس ملاقات سے پہلے ہی مہاراجہ صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی علمی شہرت اوران کی شاعرانہ عظمت کا کچھ ذکر کر رکھا تھا۔ مہارجہ صاحب بے تکلف کہنے لگے''ڈاک دار صاحب سنا ہے آپ بیت بناتے ہیں''۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی شوخی سے جواب دیا''سرکار بیت نہ کبھی میں نے بنائی ہے اور نہ کبھی میرے باپ دادا نے۔اس کے علاوہ میں ڈاک دار بھی نہیں۔نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے نہ میرے بزرگوں نے۔

مہاراجہ صاحب اقبالؔ کے ساتھیوں کا منہ دیکھنے لگے۔انہوں نے کہا ''حضور یہ شاعر ہیں اور شعر کہتے ہیں۔شعر کو بیت بھی کہتے ہیں۔انہوں نے بیت کو وہ بیت (بید) سمجھا جس سے کرسیاں بنائی جاتی ہیں''۔

مہاراجہ صاحب بولے''ٹھیک کہا آپ نے ،انہوں نے وہی بیت سمجھا ہوگا، کوئی شعر سنائیے''۔

ڈاکٹر صاحب شعر پڑھنے لگے تو مہاراجہ نے فرمایا''نہیں صاحب یوں نہیں گا کر پڑھیے۔اسی لے میں جس کی آپ کے دوست تعریف کرتے ہیں''۔

ڈاکٹر صاحب نے منشی محمد دین فوقؔ کی طرف دیکھا اوردبی زبان میں کہا، جی تو یہی چاہتا ہے کہ میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگرو باندھے جائیں تو میں گاؤں۔لیکن مہاراجہ کے احترام نے شوخی کا منہ بند کر دیا۔اس کے بعد پانچ سات شعر

ترنم ہی سے پڑھے۔آپ کے بعد مہاراجہ نے خود بھی فارسی کے چند شعر سنائے پھر کہا ''ڈاکٹری میں آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''میں تو فلسفہ کا ڈاکٹر ہوں، فزیشن و سرجن ڈاکٹر نہیں ہوں''۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا کہ سرکار یہ بھی آپ کی رعایا ہیں۔مہاراجہ نے پوچھا ''وہ کیسے؟۔یہ لاہور کے رہنے والے ہماری رعایا کس طرح ہوگئے؟'' ساتھی نے کہا ''ان کے آباء واجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ان کی ذات سپرو ہے، پنجاب میں ان کا وطن سیالکوٹ ہے''۔

مہاراجہ نے کہا ''بہت اچھا۔سرکار آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دیتی ہیں، آپ ضرور آئیں''۔

لیکن علامہ اقبال مہاراجہ کی دعوت پر کشمیر نہ آسکے۔



سرحدیں روک نہ پائیں گی کبھی رشتوں کو

جھلسا دینے والی دھوپ کے تھپڑے، دوپہر کا وقت اور رگھوناتھ بازار کی دھکم پیل۔ ہر طرف گہما گہمی کا عالم، لوگ ایک دوسرے سے بے خبر اپنے اپنے کام میں مصروف۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ''ہری تھیٹر'' کا رخ کیا جہاں اچھی خاصی چہل پہل دیکھنے کو ملی۔ غیر متوقع چہل پہل نے میری حیرت میں اضافہ کیا کیونکہ ہری تھیٹر کی خستہ حالی کا مشاہدہ میں نے پہلے بھی کیا تھا۔ اس لئے لوگوں کا رش سمجھ سے بالا تر تھا۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی پہاڑی فلم چل رہی ہے۔ میں نے بے دلی محسوس کرتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹنے میں عافیت سمجھی۔ شاید اس لئے کہ پہاڑی فلم میری دلچسپی سے میل نہیں کھاتی۔ چند ساعت ٹھہر جانے کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اتنے سارے لوگ فلم دیکھنے جمع ہوئے ہیں شاید کوئی خاص بات تو ہوگی۔ باہر چلچلاتی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہونے سے بہتر تھا کہ چند گھنٹے کہیں سائے میں رہ کر گزار لئے جائیں۔ جموں شہر کے بارے میں یہ دلچسپ بات ہے کہ یہاں ہر چیز کی فراوانی ہے مگر ستانے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں۔ اس لئے عقلمندی یہی تھی کہ ہری تھیٹر میں ہی چند گھنٹے گزار لئے جائیں۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور اندھیرا اتنا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ بڑی مشکل سے ایک سیٹ ملی جو اتنی سخت

تھی کہ پہلو بدلنے میں بھی دقت ہوتی۔ فلم کے دل نشین مناظر سے صاف پتا چلتا تھا کہ راجوری اور پونچھ کے پہاڑی سلسلوں کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ ابتدائی لمحات بوریت سے گزرے لیکن جوں ہی میں نے بغل والی سیٹ پر بیٹھے ایک بزرگوار کو بڑے انہماک سے بیٹھا پایا تو شرمندگی محسوس کرتے ہوئے میں نے حواس خمسہ کو متحرک کیا اور فلم میں دلچسپی لینا شروع کی۔ منظر بدلتے گئے اور کہانی کی گرہیں کھلتی گئیں۔ فلم رومانی موضوع پر مبنی تھی۔ جس میں ایسے دو کرداروں کی کہانی ہے جن کی جدائی میں تقسیمِ برصغیر کا کلیدی رول ہے۔ قدغنوں اور اڑچنوں کی وجہ سے دو پریمیوں کی ملاقات طویل جدائی کے بعد ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ ملاقات عارضی ثابت ہوتی ہے اور آخر میں دونوں ممالک کی سرحدوں کے درمیاں واقع نومینز لینڈ پر فلم کی ہیروائن کی موت واقع ہو جاتی ہے، جس طرح منٹو نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا اختتام درد بھرا اور حقیقت آمیز کیا تھا اسی طرح فلم کا کلائمکس بھی بنایا گیا ہے، جس سے ناظرین اپنے اندر ایک خلش لئے ہری تھیٹر سے باہر نکلتے ہیں۔ فلم دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ یہ پہاڑی زبان کی پہلی فلم ''لکیر'' ہے جس کی کہانی اردو اور پنجابی کے افسانہ نگار خالد حسین نے لکھی ہے جبکہ مکالمے پہاڑی کے معروف ادیب علی عدالت نے تحریر کئے ہیں۔ شودت کی ہدایت کاری نے کہانی میں چار چاند لگائے ہیں۔

فلم ''لکیر'' دیکھنے کے بعد میں نے خالد حسین کو مبارک بادی دینے کے لئے فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے تازہ افسانوی مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' کی رسم رونمائی کے سلسلے میں بہت مصروف ہیں۔ آخر وہ دن بھی آیا جب ''ستی سر کا سورج'' کی رسم رونمائی ایک منفرد انداز میں ہوئی۔ اکثر و بیشتر کتابوں کی رسم رونمائی میں کتاب کو مخصوص کاغذ میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے جبکہ خالد حسین نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے کتاب کا سرورق ایک بڑے سائز کے ہوڈنگ پر بنوایا تھا اور اس پر ایک خاص

قسم کا پردہ آویزاں رکھا تھا۔ چیف گیسٹ نے ہوڈنگ سے پردہ سرکایا اور ''ستی سر کا سورج'' اپنے آب وتاب کے ساتھ رونما ہوا۔ میری زندگی میں یہ ایک خاص موقعہ تھا جب اس طرح کتاب کی روسم رونمائی انجام دی جاری ہو۔ مقالہ نگاروں نے خالد حسین کے افسانوں کی بہت تعریفیں کیں۔ یہاں تک کہ پروفیسر قدوس جاوید نے خالد حسین کے افسانوں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ خالد حسین ایسے افسانہ نگار ہیں جو سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات اور تہذیب وتمدن سے لیکر مذہبیات تک کے کسی بھی موضوع کے بارے میں ''سچ'' بولنے کا مادہ رکھتے ہیں، چناچہ ان کے افسانوں میں جیتے جاگتے ماحول اور کرداروں کے جنسی حقائق ومسائل کے بارے میں اظہارِ خیال بھی ان کی اسی حق گوئی کا حصہ ہے۔ اس طرح کی باتیں سن کر ''ستی سر کا سورج'' پڑھنے کا اشتیاق بڑھا۔ بقول کسے ''جس چیز کی تلاش ہوتی ہے وہ کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے''۔

تقریب کے کچھ دن بعد ہی خالد حسین سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بڑی شفقت سے ''ستی سر کا سورج'' عنایت کی۔ جس میں فلم ''لکیر'' کی وہ کہانی بھی شامل ہے جس کی بنیاد پر پہلی پہاڑی فلم معرض وجود میں آئی ہے۔ بس پھر کیا تھا میں نے پہلی نشست میں ''لکیر'' کو ہی پڑھا جس کی تخلیق میں رپورتاژ کی تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ کہانی کا راوی (خالد حسین) اپنی روداد سفر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''کہ جب میں سات اپریل ۲۰۰۵ء میں سری نگر سے مظفر آباد جانے والے پہلے قافلے میں شامل ہونے کے لئے رختِ سفر باندھ رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ شخص نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میرا نام سجاول چودھری ہے، میں تحصیل باغ، ریاست پونچھ کا رہنے والا ہوں۔ میرا گاؤں بھوٹ بھائیاں کے پاس تھا۔ ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ

ہی مجھ پر دُکھوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ غم کے نشتروں نے میرا سینہ چھلنی کر دیا۔ دل کے زخموں نے بہت تڑپایا مگر میں کچھ نہ کر سکا اور وقت کے ہاتھوں بے بس ہو گیا۔

اصل میں یہ پوری کہانی سجاول اور صابری کے عشق پر مبنی ہے۔ دونوں سماج سے بھاگ کر شادی کرتے ہیں۔ کئی سالوں بعد صابری کو پتا چلتا ہے کہ اسکا باپ بیٹی کی جدائی میں فوت ہو گیا ہے اور ماں دیوانہ وار سڑکوں پر پھرتی ہے۔ تبھی وہ اپنے بچوں کو سجاول کو سونپتے ہوئے اپنی ماں سے ملنے کے لئے آبائی گاؤں چلی جاتی ہے اور اسی عرصہ میں سانحہ تقسیم رونماں ہوتا ہے۔ اس طرح سجاول اپنے بچوں سمیت لکیر کے اس طرف اور صابری لکیر کے اس طرف زندگی کے ساٹھ سال جدائی میں گزارتے ہیں۔ قریباً چھے دہائی بعد جب راوی کو لکیر کے اُس طرف جانے کا موقعہ ملا تو انہوں نے بڑی تگ و دو کے بعد اماں صابری کا پتا لگایا۔ دونوں حکومتوں کی طرف بڑی اڑچنیوں سے گزرنے کے بعد دونوں کی ملاقات ممکن ہوتی ہے لیکن جب سرکار کی طرف سے دی گئی مہلت ختم ہو جاتی ہے تو سجاول چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اس عمر میں اسے وہاں کون سنبھالے گا۔ وہاں اس کا کون ہے، اگر صابری یہاں رہ جائے تو سرکار کا کیا جائے گا۔ اسّی سالہ بڑھیا سے سرکار کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے، لیکن مجبوراً اماں صابری کو جانا پڑتا ہے اور وہ مڑ مڑ کر سجاول اور اپنے بچوں کو دیکھتی ہیں۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ نومینز لینڈ کے بیچ پہنچ کر ستانے لگتی ہے اور دو چار قدم چلتے ہی اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں اور گر جاتی ہے۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اماں صابری نے نومینز لینڈ کی حد پار کرنے سے پہلے ہی حقیقی سرحدوں کی طرف پرواز کرنے میں عافیت سمجھی۔ فلم نے عالمی دانشوروں کے سامنے یہ سوال کھڑا کیا کہ ''لکیر'' نے زمین کو ہی نہیں بانٹا بلکہ جسموں اور روحوں کے درمیان بھی ایک دیوار حائل کر دی۔

.....●.....

بہر صورت مجھے پہچانتے ہیں

جب ریڈیو کشمیر پر یہ اعلان ہوا کہ پروفیسر حامدی کاشمیری کو پدم شری اعزاز کے لئے نامزد کیا گیا ہے تو مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی۔ جس کی دوہری وجہ ہے اول حامدی صاحب اردو کے جید اور نامور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں دوئم اس لئے کہ ان کا تعلق سرزمین کاشمیر سے ہے۔ عصری تنقیدی دبستان میں جن سرکردہ نقادوں نے اپنا لوہا منوایا، ان میں شمس الرحمان فارقی، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، وارث علوی، فضیل جعفری، شمیم حنفی، وہاب اشرفی، مغنی تبسم اور حامدی کاشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حامدی صاحب کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں قریباً تیس تنقیدی کتابیں، دس شعری مجموعے، چار افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور ایک سفر نامہ بھی شامل ہے۔ ذمہ دار عہدوں پر فائز رہتے ہوئے ایس پی کالج کے لیکچرار سے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک کا سفر کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ حامدی صاحب کی کثیر الجہات شخصیت کا اعتراف بہت دیر بعد ہوا، میرے خیال سے پدم شری کا اعزاز انہیں بہت پہلے ملنا چاہئے تھا۔ بقول حامدی کاشمیری:۔

جو تھوڑی سی بھی اردو جانتے ہیں
بہر صورت مجھے پہچانتے ہیں

ذاتی طور پر حامدی صاحب کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میری دیرینہ خواہش دوران ایم اے پوری ہوئی جب ایک مرتبہ ڈاکٹر ارتضی کریم اور پروفیسر قدوس جاوید کے ساتھ حامدی صاحب کے دولت کدے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ جوں ہی ہماری گاڑی ڈل جھیل کی پُر فضا ہواؤں کو چیرتی ہوئی شالیمار باغ کے عقب میں واقع کوہ سبز کی اونچائی پر پہنچی، تو حامدی صاحب کا نشیمن دیکھ کر بے ساختہ علامہ اقبالؔ کے یہ اشعار زبان پر آ گئے۔

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھونپڑا ہو

حامدی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ مصرہ مریم صاحبہ نے بڑی خاطر تواضع کی اور چائے کا دور دورہ چلا۔ حامدی صاحب ہر مرتبہ اپنے تنقیدی نظریے ''اکتشافی تنقید'' کو زیر بحث لاتے اور اس کوشش میں لگے رہتے کہ ہم ان کے مطمح نظر کو سمجھیں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کا رد عمل بھی کریں۔ قدوس صاحب نے کئی سوالات اکتشافی تنقید کے حوالے سے کئے۔ جن کے جوابات حامدی صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے دیئے۔ یہاں تک کہ ایک بار اپنا ایک شعر موضوع سخن بناتے وقت جذباتی ہو گئے۔

عجیب دُھوپ تھی سب کو برہنہ کرتی تھی
سیہ حروف کو ملبوس کر گیا کوئی

گھر کے باہر دھوپ تھی، عجیب دھوپ، ایسی کہ سب کو برہنہ کرتی تھی۔ اس میں اس قدر حدت تھی کہ لوگ خود ہی بے لباس ہو جاتے تھے یا اس قدر شعلہ بار تھی کہ

سب کے ملبوس جل جاتے تھے اور وہ برہنہ ہو جاتے تھے۔ شعر کا راوی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس بھیڑ میں کوئی ایک اپنا بچاؤ چاہتا تھا، وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اس دھوپ سے بچنے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے بدن کو سیاہ حروف سے ڈھانپ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی عام آدمی نہیں کرسکتا۔ کوئی فن کار کرسکتا ہے۔ اس ساری صورت حال کو imagine کرو۔ اب دیکھنا یہ ہے تن ڈھانپنا، یعنی پناہ لینا، ظاہر ہے حروف (شاعری) تیز دھوپ کا سد باب نہیں کرسکتے لیکن یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شاعری تحفظ کا سامان کرسکتی ہے۔ یہ مقدس حروف یا دعائیہ حروف بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ آگ برساتی دھوپ سے پناہ دے سکتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سیاہ حروف جو بھی ہیں اس دھوپ کی تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ یہ شعر چند الفاظ یعنی دھوپ، سیہ حروف اور ملبوس سے علامتی فضا کو خلق کرتا ہے اور ایک سے زائد معانی کا احاطہ کرتا ہے۔ حامدی صاحب کی زبانی شعر کی تفہیم سے معنی ایک ایک کر کے میرے ذہن میں اترتے جاتے تھے اور میں گویا کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے متن کی اکتشافی قرأت پر زور دیتے ہوئے سات نکات کی نشاندہی کی۔

۱۔ مصنف کا متن سے اخراج

۲۔ متن میں موضوعیت کے بجائے تجربے کی دریافت

۳۔ قاری کی متن سے رشتگی

۴۔ تجربے کی نمو پذیری

۵۔ تجربے کی کثیر الجہتی

۶۔ قاری کے جمالیاتی اور فکری مقتضیات

۷۔ متن کی قدر سنجی

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے حامدی صاحب کو یہ کہہ کر ٹوکا کہ جناب اب ہمیں بھی

کچھ نام کمانے کا موقعہ دیجئے اس پر سب ہنسنے لگے۔ میں نے موقعہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے حامدی صاحب کی توجہ اردو افسانہ کی طرف مبذول کی۔ حامدی صاحب نے چند لمحے توقف کرتے ہوئے کہا کہ افسانے کے بارے میں جو تنقیدیں ملتی ہیں وہ اپنی محدودیت کا احساس دلاتی ہیں یہ افسانے کے تئیں نقادوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی غماز ہے۔ نقادوں کے اس رویے کی ایک وجہ ان کی سہل پسندی بھی ہوسکتی ہے وہ شاید کسی افسانہ نگار کی قدر سنجی کے لئے اس کی جملہ تصانیف کے علاوہ پورے افسانوی ادب کا مطالعہ خاصا دقت طلب اور time consuming تصور کرتے ہیں۔

حامدی صاحب کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ حامدی صاحب افسانہ کا تجزیہ کرتے وقت افسانہ کی تشریح وتعبیر کو نثری روپ دینے کو تنقیدی عمل نہیں مانتے بلکہ وہ افسانے کی ساخت، واقعات، کردار اور ماحول کی اکتشافی صورتحال کا تجزیہ کرکے قاری کو تخیلی دنیا سے گزار کر افسانہ کے اسرار ورموز سے آگاہی دیتے ہیں۔ اس لئے وہ افسانہ کے متن کا مطالعہ کرتے وقت افسانے کے پہلے جملے سے ہی اکتشافی عمل شروع کرکے کہانی کی گرہیں کھول دیتے ہیں۔ پریم چند کے شاہکار افسانہ ''کفن'' کے پہلے اقتباس کو لے لیجئے۔

''جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردِزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی''۔

بس پھر کیا تھا کہ حامدی صاحب نے افسانے کے پہلے ہی جملے سے اکتشافی تھیوری کا استعمال کرکے اپنا استدلال یوں پیش کیا۔

''یہ جملہ ایک تجسس خیز اور بصری ڈرامائی صورتحال جو کردار، ہیئت، فضا اور تحرک سے عبارت ہے کی نمود کو ممکن بناتا ہے۔ افسانے کا یہ اولین

جملہ خارجی سطح پر ہی فضا آفرینی نہیں کرتا بلکہ داخلی سطح پر بھی کرداروں یعنی باپ اور بیٹے کی ذہنی کیفیت کو منکشف کرتا ہے" دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے تھے" میں "بجھے ہوئے الاؤ" اور "خاموش" ان کے داخلی وجود کی بے حسی، تاریکی، خستگی اور لاتعلق کا رمز بن جاتی ہے اور پھر اس جملے کے بقیہ حصہ یعنی " اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھارہی تھی" میں "جوان بیوی" اور اس کا "دردزہ" میں مبتلا ہونا زندگی کے اثباتی اور امکانی پہلو کو نمایاں کرتا ہے اس طرح افسانے کا پہلا جملہ ایک متناقض (Paradoxical) صورتحال پیدا کرتا ہے۔

حامدی صاحب کی معلومات سے بھری باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ ان کو درسی تنقید کے موئدین سے گلہ ہے کہ جنہوں نے اکتشافی تنقید کو سمجھنے کی بجائے سنی سنائی باتوں پر اپنی رائے دینا شروع کردی ہے۔ میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ آپ نے ریاستی ادیبوں پر بہت کم لکھا ہے۔ میری بات سنتے ہی مسکرانے لگے کہ ہر ایک ادیب چاہتا ہے کہ میں اس کی کتاب پر مضمون لکھوں، لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جب تک کوئی تخلیق نقاد کو اپیل نہ کریں وہ اس پر خامہ فرسائی کیسا کرسکتا ہے۔ آج کا قلم کار پڑھے لکھے بغیر ادبی نروان چاہتا ہے جو کبھی ممکن نہیں ہے ۔میں نے تو پوری زندگی میر، غالب اور اقبال کو پڑھنے میں صرف کردی، تب کہیں مجھ پر شعر کے اکتشافی اسرار آشکار ہوئے۔

......●......

یہ کالم پروفیسر حامدی کاشمیری کی زندگی میں ہی چھپ گیا تھا۔انہوں نے فون پر میری بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ حامدی کاشمیری کا انتقال ۲۷ردسمبر ۲۰۱۸ میں ہوا۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردس میں جگہ دے۔ آمین

پھر کوئی آیا، دلِ زار، نہیں کوئی نہیں

لڑکپن میں خونچہ فروش سے مونگ پھلی کی ایک پڑیا خریدی۔ جوں ہی میں نے مونگ پھلی کے دانے ختم کئے تو کاغذ کے ایک طرف خوش خطی میں کچھ اشعار لکھے ہوئے تھے، چونکہ میں اس عمر میں شعروشاعری سے نابلد تھا تو غیر دانستہ طور پر مجھے ان اشعار میں ایک مصرعہ گنگنانے میں قدرے لطف محسوس ہوا اور یوں وہ مصرعہ مجھے ازبر ہو گیا۔

پھر کوئی آیا ،دلِ زار ،نہیں کوئی نہیں

بارہویں جماعت کے امتحان سے کامیاب ہونے کے بعد میں نے امر سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اکثر ادبی محفلیں ''تاثیر ہال'' میں ہوتیں اور میں ایک کونے میں بیٹھ کر ادبی محفلوں کا حظ لیتا اور اس کوشش میں رہتا کہ میں بھی ان تقریبات میں حصہ لوں۔ لیکن میری اتنی ہمت نہیں بندھتی کہ میں اپنی کوئی تخلیق سامنے آکر سب کو سناؤں۔ ان دنوں مجھے آزاد نظمیں لکھنے کا شوق چرایا تھا جو بعد میں معیاری تخلیقات پڑھ کر چھوٹ گیا۔ ہمارے نصاب میں نظموں کے حوالے سے ایک باب ہوا کرتا تھا جس میں حالؔی، اقبالؔ، جوشؔ، فیض احمد فیضؔ۔ راشدؔ، میراجی، اخترؔ الایمان، مخدومؔ محی الدین وغیرہ قابل ذکر شعراء ہیں۔ جب استادِ محترم نے فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' کی قرأت اپنے مخصوص انداز میں کی۔ میری خوشی کی انتہا ہی نہیں رہی کیونکہ یہ وہی اشعار تھے، جو میں

نے غیر دانستہ طور پر لڑکپن میں پڑھے تھے۔ نظم کے اشعار یوں ہیں:

پھر کوئی آیا ، دلِ زار ، نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں ، بڑھادو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

استاد محترم نے اپنا لیکچر اس بات پر ختم کیا کہ ہمارے کالج میں جو "تاثیر ہال" ہے، وہ اصل میں پروفیسر محمد دین تاثیر کے نام منسوب ہے، جو فیض احمد فیضؔ کے ہم زلف تھے۔ ساتھ ہی یہ انکشاف کیا کہ فیض احمد فیضؔ کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھوایا ہے۔ یہ سن کر میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ فیضؔ کی نکاح خوانی کشمیر میں ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کچھ سوالات نے جنم لیا کہ فیض کشمیر کب آئے اور ان کی شادی کہاں پر ہوئی۔ پہلے میں نے سوچا شاید انہوں نے کسی کشمیری لڑکی سے شادی کی ہوگی لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک انگریز میم تھی جس کا نام ایلسؔ تھا۔

اصل میں واقعہ یوں ہے کہ پروفیسر محمد دین تاثیر المعروف ایم، ڈی تاثیر امر سنگھ کالج کے بانی پرنسپل رہے ہیں۔ ان کو علامہ اقبالؔ کے ساتھ بڑی قربت رہی ہے یہاں تک کہ علامہ اقبالؔ نے کیمبرج یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے انہیں ایک سفارشی مراسلہ بھی دیا، جس کی وجہ سے انہیں وہاں کافی عزت ملی۔ تاثیر

مرحوم ایک محنتی اور ہونہار طالب علم تھے۔انہوں نے بڑی محنت سے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے اپنا مقالہ ''انگریزی ادب کی پانچ سوسالہ تاریخ کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ'' قلم بند کیا، جسے بہت سراہا گیا۔مرحوم برصغیر کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا ہے۔کیمبرج سے واپسی پر انہوں نے مسلم اینگلو اورینٹل کالج امرتسر میں بحیثیت پرنسپل عہدہ سنبھالا۔ان دنوں فیضؔ احمد فیضؔ اسی کالج میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔دنوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ایک دن تاثیرؔ صاحب سودا سلف لانے کے لئے بازار گئے تھے تو وہاں ایک لندن نژاد خاتون سے سامنا ہوا۔جس کا نام کرسٹیبل جارج تھا۔پہلے پہل بات ملاقات تک بڑھی، پھر دوستی اور آخر پر دونوں کی شادی ہوگئی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ کرسٹیبل جارج کا اسلامی نام بلقیس تاثیر رکھا گیا اور نکاح خوانی علامہ اقبال نے لاہور میں انجام دی۔ساتھ ہی نکاح خوانی کے لئے ایک شرط نامہ مرتب ہوا، جو علامہ اقبال نے انگریزی میں تحریر کیا۔حسن اتفاق دیکھئے کہ جب بلقیس تاثیر کی بہن ایلس جارج امرتسر سیر وسیاحت کی غرض سے آئی تھی۔ وہاں ایلس کی ملاقات فیضؔ احمد فیضؔ کے ساتھ ہوئی۔دوسال عشق وعاشقی میں گزر گئے۔ پھر 28؍اکتوبر 1941ء کو مس ایلس جارج سے اسلامی شرع کے مطابق نکاح ہوا۔فیضؔ کی مالی حالت اگرچہ ان دنوں نہایت ہی پتلی تھی پھر بھی انہوں نے پانچ ہزار روپے بطور مہر ادا کئے۔نکاح کے بعد ایلس کا اسلامی نام ''کلثوم'' رکھا گیا جو فیض کی والدہ نے تجویز کیا تھا۔بعد میں فیض نے اپنے شعری مجموعے ''دستِ صبا'' کا انتساب کلثوم کے نام کیا۔مرزا ظفر الحسن فیضؔ کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''براتیوں میں جوشؔ ملیح آبادی اور مجازؔ مرحوم بھی شامل تھے۔فیضؔ کے مالی حالات اتنے سقیم تھے کہ وہ اپنے لئے کپڑے بھی نہ سلوا سکے۔صرف ایلسؔ کے لئے ایک انگوٹھی خرید سکے کیوں کہ ایلسؔ

نے صرف یہی خواہش کی تھی کہ انہیں شادی میں انگوٹھی ضرور پہنائی جائے۔متفرق اخراجات کے لئے فیض کو میاں افتخار الدین مرحوم سے تین سو روپے قرض لینے پڑے تھے۔نکاح نامے پر فیضؔ اور ایلسؔ کے دستخطوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ، جی۔ایم صادق، ڈاکٹر تاثیر اور نور حسین کے دستخط ہیں جو ان دنوں سری نگر میں ہیلتھ انسپکٹر تھے۔بیگم تاثیر کے بھی دستخط ہیں جو ایلس کی سگی بہن ہیں۔نکاح سے پہلے طرفین میں ایک تحریری معاہدہ ہوا جو اس معاہدے کی نقل ہے جو علامہ اقبالؔ نے ڈاکٹر تاثیر اور بیگم تاثیر کی شادی کے سلسلے میں انگریزی میں مرتب کیا تھا۔"

......●......

پردۂ سیمیں کے سو سال

انتظار کی شدت کا اندازہ بچپن میں اتوار کی شام، اس وقت ہوتا تھا جب پورے ہفتہ میں ٹیلی ویژن پر صرف ایک بار ہندی فلم چلتی تھی۔ اُن دنوں ہر گھر میں ٹی وی نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی کے گھر میں ٹیلی ویژن ہوتا بھی تو وہ بلیک اینڈ وائٹ ہوتا تھا۔ ہمارے پڑوسی کے یہاں ایک بڑے سائز کا بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن ہوا کرتا تھا جو تین گھنٹے متواتر چلنے کے بعد خود بخود بند ہو جاتا اور ہمارا پڑوسی یہ کہہ کر ہمیں بھگا دیتا کہ ٹی وی کا انجن گرم ہو گیا ہے۔ جب بعد میں پتا چلا کی ٹی وی کا کوئی انجن ہی نہیں ہوتا تو اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے کہ ہمیں کس طرح بیوقوف بنایا جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح اتوار کی وہ شام یاد ہے جب ٹی وی پر فلم ''شعلے'' آنے والی تھی۔ ہمارے پڑوسی کے گھر میں بچوں کا تانتا بندھا، جیسے کوئی میلہ لگنے والا ہو۔ ایک گھنٹہ پہلے ہی ٹی وی کے گرد ڈیرا جمانے میں سبقت لینے کی سرگرمی شروع ہوئی۔ فلم شروع ہوتے ہی ایک شور برپا ہوا کہ ''شعلے شعلے''۔ کمرے میں ایک سکوت سا طاری ہو گیا جیسے سب مبہوط ہو گئے ہوں۔ ابھی ایک آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک بجلی نے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ پھر کیا تھا سارے محلے کے لڑکوں نے نیشنل ہائی وے بند کرنے کے لئے ٹائر جلائے اور ساتھ ہی بڑے بڑے کھمبے سڑک کے بیچوں بیچ رکھ کر پورے ٹریفک نظام کو مفلوج

کیا۔ یہاں تک کہ محکمہ بجلی کو ترسیلی نظام میں آئی رکاوٹ دور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ بجلی بحال ہوتے ہی سڑک سنسان ہوئی اور ہم سب پھر فلم دیکھنے میں مشغول ہوئے۔ رات دیر تک والدین انتظار کرتے کہ بچے آئیں اور کھانا پروسا جائے لیکن ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر فلم دیکھنے میں مگن رہتے۔ پھر اگلے دن صبح سکول کی اسمبلی ہونے سے پہلے ہی لڑکے مختلف دائروں میں بٹ کر فلم پر اپنی بساط بھر تبصرہ شروع کر دیتے۔ جس نے فلم دیکھی ہوتی وہ بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ یہاں تک کہ بعض لڑکے فلم کے ڈائیلاگ بھی دہراتے اور کبھی کبھار ہیرو کی نقل بھی اُتارتے۔ اس طرح یہ سلسلہ ہر اتوار کو چلتا۔ لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہر گھر میں کلر ٹی وی ہوتا ہے اور ہر ٹی وی پر سو سے زائد چینلز ہیں۔ فلموں کی اتنی بھرمار ہے کہ چینل بدلتے وقت یاد نہیں رہتا کہ ہم کیا دیکھ رہے تھے۔ شاید اسی کو گلیمر کی دنیا کہا جاتا ہے۔

فلموں کی بات چلی تو آجکل ہر طرف یہی موضوع زیر بحث ہے کہ ہندی سنیما کو پورے سو سال مکمل ہو چکے ہیں۔ دادا صاحب پھالکے نے جب پہلی خاموش ہندی فلم ''راجہ ہریش چندر'' ۱۹۱۳ء میں بنائی تو اسے ہندوستان میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ تصور کیا گیا۔ اس طرح دادا صاحب نے باضابطہ ہندی فلم صنعت کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے زیادہ فلمیں دھارمک اور اخلاقیات کے موضوعات پر بنائی۔ دادا صاحب خود سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور ساتھ ہی انہیں مصوری، موسیقی اور اداکاری سے خاص لگاؤ بھی تھا۔ فلم کی تکنیک اور اسرار و رموز سیکھنے کے لئے جرمنی کا سفر کیا۔ وہاں کچھ پروفیشنل کورسز بھی کئے ۱۹۱۳ء سے لیکر ۱۹۳۰ء قریباً دو سو خاموش فلمیں بنیں، جن میں زیادہ تر دادا صاحب پھالکے نے بنائیں۔ جو اپنے زمانے میں خوب چلیں۔ راجہ ہریش چندر، ساوتری، کرشنا، جنم اور رلنکا دھنس کا مشہور ہوئیں۔ دادا صاحب نے اپنے انیس سالہ فلمی کریئر میں ۹۵ فلمیں اور ۲۶ مختصر فلمیں بنائی۔ ان

کا دیرینہ خواب تھا کہ وہ خاموش فلموں میں کرداروں کو مکالمے ادا کرتے سنتے۔ ان کا یہ خواب ان کی زندگی میں اردشیر ایرانی نے پورا کیا، جب انہوں نے ۱۹۳۱ء میں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' بنا کر ہندوستانی عوام کو حیرت زدہ کردیا۔ اس فلم کو دیکھنے کے لئے ممبئی کے میجسٹک سنیما میں چھ ماہ تک لوگوں کی بھیڑ رہی۔

خان بہادر اردشیر ایرانی ایک پارسی تھا جس نے فلم صنعت میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ خاموش فلموں کا سکوت توڑ کر فلم بینوں کو مکالموں کی لذت سے آشنا کیا۔ اردشیر ایرانی کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے انیس سال کی عمر میں ''ٹینٹ سنیما'' قائم کیا جہاں وہ مغربی فلمیں چلاتے تھے۔ ان کی تجارتی فکر نے فلمی صنعت میں مزید وسعت لائی۔ فلموں کے تخلیقی اور تکنیکی پہلوؤں میں خاص نظر ہونے کی وجہ سے جلد ہی فلمی دنیا پر چھا گئے یہاں تک کہ دادا صاحب پھالکے بھی اپنی فلموں میں ان کی خدمات لیتے رہے۔ ایرانی نے اپنے فلمی سفر میں ایک سو پچاس سے زائد بلیک اینڈ وائٹ فلمیں بنائیں۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے Cine colour film process کی تکنیک پر پہلی کلر لیب قائم کی۔ جہاں پہلی رنگین ہندی فلم ''کسان کنیا'' مکمل ہوئی۔ اس طرح ہندی سنیما ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اردشیر ایرانی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں پہلی فارسی اور عربی فلم بھی بنائی۔

ہندی سنیما کے پورے سو سال کے سفر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ فلم کے بنیاد گزروں نے جب ہندی فلم کا آغاز کیا تو انہوں نے سماجی برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے فلم کو ایک بہترین میڈیم تصور کیا تھا۔ یہاں تک کہ فلم کو ایک دور میں صحت مند سماج کا عکاس کہا جاتا تھا۔ موضوعات کچھ بھی ہوں لیکن آخر پر سچائی کی جیت دکھانا ایک لازمی امر سمجھا جاتا تھا۔ فلم ''سوامی'' کے بارے میں مشہور ہے کہ

''ممبئی کی ایک عدالت میں میاں بیوی کے درمیان طلاق کا معاملہ عدالت میں پیش ہوا۔طلاق دینے سے قبل مجسٹریٹ نے میاں اور بیوی کو مفید مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ طلاق دینے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ دونوں فلم ''سوامی'' ضرور دیکھ لیں۔اس کے بعد طلاق دے دینا۔مجسٹریٹ کی بات سن کر دونوں نے فلم دیکھ لی اور آپس میں صلح کرلی۔''

کلاسیکل فلموں کی یہی خاصیت ہوتی تھی۔ان کو ایک خاص مقصد کے تحت بنایا جاتا تھا، ساتھ ہی کرداروں کے مکالموں میں دلنشین زبان کی چاشنی بھی ملتی تھی۔ نغموں کا انتخاب اور منظر نگاری کی سچویشن میں خاص اہتمام رکھا جاتا تھا۔اس لئے آج بھی ساحرؔ، مجروحؔ، کیفیؔ، شکیلؔ، حسرتؔ اور جانثارؔ کے گیت زبان زد خاص وعام ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب نے فلمی دنیا کو بڑی بلندی عطا کی لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندی فلم کے مکالمے اردو زبان میں ہوتے ہوئے بھی سنسر بورڈ فلم کو ہندی کی سٹرفکیٹ دیتا ہے جو اردو زبان وادب پر ایک بڑا ظلم ہے، جس پر اردو نوازوں کو سراپا احتجاج ہونا چاہیئے۔

......●......

بہت انمول ہے مضطر تری یادوں کا سرمایہ

موجودہ گلیمر کی دنیا میں TRP) Television Rating Points) کی اصطلاح عام ہوگئی ہے۔ ہر پروگرام کی TRP بڑھانے کے لئے نت نئے Reality Shows بڑی آب تاب کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں جن میں جیتنے والوں کو ایک ہزار سے لے کر پانچ کروڑ تک کی کثیر رقم بطور انعام ملتی ہے۔ اس طرح کے شو ناظرین بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ دو دہائی قبل جب ہر گھر کے ہر کمرے میں ٹی وی نہیں ہوتا اور کیبل نیٹ ورک کا کوئی نام ونشان نہیں تھا اگر کسی کو پی ٹی وی دیکھنے کا شوق ہوتا تو مکان کی چھت پر پتلی المونیم سے بنی ایک انٹینا نصب کرنا پڑتی اور پھر کئی اطراف گھما کر صحیح سمت ملتی اور پی ٹی وی کے پروگرام دیکھنا نصیب ہوتے۔ ان دنوں پی ٹی وی پر ایک ریلٹی شو ''نیلام گھر'' کے نام سے ہوتا تھا جس میں طارق عزیز کی اینکرینگ اتنی دلچسپ ہوتی کہ پروگرام ختم ہونے تک کوئی دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ طارق عزیز کے سوالات کرنے کا ڈھنگ اتنا نرالا ہوتا کہ ہم لوگ گھر بیٹھے جوابات دینے کی کوشش کرتے جیسے ہمیں بھی انعامات ملنے کی امید ہو۔ ''نیلام گھر'' میرے ذہن کے محفوظ خانہ میں قید ہو کر رہ گیا تھا، جب بھی کوئی ریلٹی شو دیکھتا تو ''نیلام گھر'' کی یادِ پارینہ تازہ ہو جاتی۔ حسن اتفاق سے ایک دن ہفت

روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں جاوید آذر کا مضمون ''نیلام گھر'' کے حوالے سے پڑھا، پہلے مجھے شبہ ہوا کہ مضمون طارق عزیز والا ''نیلام گھر'' کے متعلق ہوگا لیکن چند سطور پڑھ کر معلوم ہوا کہ کشمیر کے معروف نظم نگار طاہر مضطرؔ کے شعری مجموعے کا عنوان بھی ''نیلام گھر'' ہے۔ کہتے ہیں نا کہ اگر آپ کسی چیز کو پسند کرتے ہیں تو اس کے متعلق معلومات دریافت کرنا غیر شعوری طور شروع ہو جاتا ہے۔ جاوید آذر کا مضمون پڑھ کر میرے اشتیاق کی شدت بڑھی کہ میں طاہر مضطرؔ سے ملوں اور ان کے شعری مجموعہ ''نیلام گھر'' سے مستفید ہوسکوں۔ کیونکہ بقولِ آذرؔ ''طاہرؔ کی کئی نظموں کی روانی تو ایک پہاڑی ندی کی مانند ہے جو نہ تھمنے کا نام لیتی ہے نہ رکنے کا اور نہ تھکنے کا''۔ پھر کیا تھا میری آرزو پروفیسر مخمور حسین بدخشی صاحب کی وساطت سے بھر آئی جو طاہر مضطر کے سمدھی بھی ہیں اور معروف افسانہ نگار بھی۔

میری پہلی ملاقات مضطر صاحب سے ان کی رہائش گاہ واقع سنت نگر راول پورہ سری نگر میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران پہلے پہل میں سنبھل کر بات کرنے لگا لیکن بدخشی صاحب کی موجودگی میں طاہر مضطر کی اپنائیت اور باتوں میں فراخ دلی کا عنصر شامل ہوگیا۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور کتاب کے عنوان ''نیلام گھر'' کا موضوع چھیڑا۔ پہلے کچھ دیر توقف کیا اور پھر ہنستے ہوئے گویا ہوئے کہ تم نے شیکسپیرؔ کا وہ جملہ سنا ہوگا جس میں انہوں نے دنیا کو ایک سٹیج قرار دیا ہے اور دنیا میں ہر آنے والے کو سٹیج کا کردار۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو در جواب کہا کہ میں یہاں شیکسپیرؔ سے اختلاف کرتا ہوں۔ اختلاف کا لفظ سن کر میری دلچسپی مزید بڑھ گئی کیونکہ میں پہلی بار سن رہا تھا کہ کوئی شیکسپیرؔ سے بھی اختلاف کر سکتا ہے۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دنیا اصل میں ایک نیلام گھر ہے اور یہاں ہر ایک شخص نیلام ہوتا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ نیلام ہونے کے وقت کس کی کیا قیمت لگے گی۔ ساتھ ہی اپنی نظم

''نیلام گھر'' کا آخری حصہ پڑھنے لگے جوان کو اس طرح از بر تھا جیسے کوئی خاص وظیفہ ورد ہوتا ہے۔

''یہ تو نیلام گھر ہے
یہاں ہو جاتا ہے سب کا نیلام
کس طرح روکوں
کیسے ٹوکوں
میں کیسے بولوں
کس طرح اپنی زبان کھولوں
نام تیرا جو زبان پر مری آجائے گا
میں ڈرتا ہوں
کہ نیلام کے وقت کہیں قیمت نہ تری گر جائے''

نظم کا بند سنانے کے بعد فوراً کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں حیران و پریشان بدخشی صاحب کو تکتا رہا لیکن ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا کیا کہیے برمحل بول اُٹھے کہ طاہر صاحب اپنے لئے کچھ کھانے کو لانے کے لئے گئے ہوں گے۔ میں ابھی پوری بات سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ طاہر صاحب ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں نون چائے کا بھرا مگ لئے کمرے میں وارد ہوئے اور پیچھے پیچھے ان کا خادم، روایتی انداز میں نون چائے کی کیتل اور پانپور کی شیرمال ایک بڑی رکابی میں لے کر ہماری خاطر تواضع میں جٹ گیا۔ نون چائے کی کشش، بدخشی صاحب کی ظرافت اور مضطر صاحب کی مزے دار باتیں میری زندگی کا ایک انمول سرمایہ ہیں جو پھر کبھی مجھے نصیب نہیں ہوئیں۔

میں مضطر صاحب کی باتوں سے کافی متاثر ہوا کیوں کہ ان کے موضوعات

زندگی کے ہر شعبے سے جڑے تھے۔ میں نے زندگی کے سفر کے بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگے بھائی میں تو پہلے سرکاری نوکری کرتا تھا پھر دکانداری کا شوق چرایا۔ دکانداری سے طبیعت اوب گئی تو صحافت کے خارزار میں قسمت آزمائی شروع کی۔ صحافت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے سیاست کا حصہ بھی بنا لیکن شومئی قسمت سیاست بھی راس نہیں آئی اور خالص ادب تک ہی خود کو محدود کرنے کی شعوری کوشش کی۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر یہ سمجھ چکا ہوں کہ دنیا سچ مچ ''نیلام گھر'' ہے۔ یہاں چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی ہے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مضطرؔ صاحب کی طبیعت مکدر ہو چکی ہے اور انہیں اب کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

میں نے جب مضطرؔ صاحب کو ایک سنجیدہ فلسفی کی طرح باتیں کرتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ انہیں زندگی میں کئی مشکل پڑاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے جن کے اثرات ان کی نظموں میں صاف جھلکتے ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے پابند شاعری میں قید ہونے کے بجائے آزاد شاعری میں خود کو comfortable محسوس کیا۔ ان کی نظموں کے عنوانات حادثہ، اپنی ذات سے ایک سوال، بوالہوسی، میں راتوں کو اب جاگتا ہوں، مونولاگ، کرب، مقتل اور نیلام گھر وغیرہ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ شاعر تخیل کی نخلستان کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر اپنا تخلیقی آشیانہ تعمیر کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ اس سے یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ مضطرؔ صاحب حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کہنہ مشق شعراء و ادباء نے بھی کیا ہے جن میں جگن ناتھ آزادؔ، فاروق نازکیؔ، حامدی کاشمیری، مظہر امامؔ، شمس الرحمان فاروقی، رحمان راہی، بلراج کومل، محمد یوسف ٹینگ، عرشؔ صہبائی، نور شاہ، ظہور الدین، پشکر ناتھ، محمد زماں آزردہ، حسن ساہو، وریندر پٹواری، فریدؔ پربتی، جاوید آذرؔ، اسیر کشتواڑی، منور امروہی اور فریدہ کول قابل ذکر ہیں۔

اس ملاقات کے بعد پھر ہمارا رابطہ اکثر و بیشتر فیس بک پر ہوتا۔ ہمیشہ یہی گلہ ہوتا کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالو۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا آخری شعری مجموعہ ''لہولہو کشمیر'' کی پروف ریڈنگ میں ان کی معاونت کروں لیکن میں ذاتی مصروفیات کی بنا پر وعدہ کرتا رہا لیکن ایفا نہ کر سکا۔ ساتھ ہی انہوں نے شرائن بورڈ کے حوالے سے ایک تاریخی کتاب انگریزی میں لکھی تھی لیکن ابھی طباعت کا مرحلہ باقی تھا۔ اب فیس بک مرحوم کی مصروفیات کا اچھا ذریعہ بن گیا تھا۔ میں نے جب بھی مضطر صاحب کے Status کا مطالعہ کیا تو وہ طارق عزیز کی طرح ''نیلام گھر'' برپا کرنے پر تلے نظر آتے۔ ہر Status میں کوئی نہ کوئی سوال پوشیدہ ہوتا یہاں تک کہ ایک بار انعام دینے کا بھی اعلان کیا۔ میں حیران ہوں کہ مرنے سے ایک دن قبل 26 مارچ بارہ بج کر تیرہ منٹ پر اپنے فیس بک وال پر ایک سوال چسپاں کیا جس کا جواب سنے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

Please educate me.........''

Reply my one Question ....

Is age of humans,necessarily wisdom ??

......●......

ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

کالج کے دنوں میں ہمارے مقامی علاقے میں چند نوجوانوں نے ایک ادبی گروپ ''کہکشاں'' کے نام سے بنایا جس میں ہم سب نوعمر اور نوآموز لکھنے والے جمع ہوتے تھے۔ گروپ میں بلال حسین، رؤف راحت، سلیم ساغر، ساجد احمد، ریاض ملہ، امتیاز نقاش، عادل شفیع اور خاکسار بھی شامل تھا۔ جس میں ہم صرف اپنی تخلیقی کاوشوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھتے تھے۔ ہفتہ وار محفلیں ہوتیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے ملنے کا بہانہ بھی مل جاتا۔ ملنے کے لئے کوئی مخصوص جگہ نہیں ہوتی اس لئے کبھی دکان کے تھڑے پر اور کبھی میوہ منڈی کی سڑکوں پر ہی محفلیں جمتیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ایسی دنیا جہاں سے گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پھر شام گئے اندھیرے سے احساس ہوتا کہ کہیں گھر والے پریشان نہ ہو کیونکہ حالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ پھر ایک دن یہ طے ہوا کہ ہر ہفتہ کسی اچھے ادیب یا شاعر کی تخلیق کو بھی ہم سنا کریں گے۔ اس لئے سب پر ذمہ داری عائد کی گئی کہ اگر دوران مطالعہ کوئی اچھی اور معیاری تحریر نظروں سے گزرے تو وہ اپنے ساتھ لایا کریں۔ اس طرح ہمیں کچھ اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ ایک دفعہ گروپ کے ایک ممبر نے اخبار کا تراشا ساتھ لایا۔ جس میں ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ جب کہانی پڑھی گئی تو سب پر سکوت

طاری ہوگیا۔ مجھے آج اس کہانی کی تھیم یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ کہانی کسی پنڈت جی نے تحریر کی تھی۔ ہم سب کہانی سن کر خوش ہوئے اور صحیح معنوں میں لگا کہ کہانی اسی طرح لکھی جاتی ہے۔ شاید میری کہانیوں کی دلچسپی میں یہ کہانی ایک سنگ میل بن گئی۔ میں نے دوست سے تراشا لے کر فائل میں محفوظ کرلیا کیونکہ ہم لوگ ہفتہ وار تخلیقات کی ایک فائل maintain کرتے تھے۔ زمانہ گزرتا گیا اور گروپ کے سارے ممبر آہستہ آہستہ اپنے کیریئر کی فکر میں الجھ گئے اور ''کہکشاں گروپ'' ماضی کی یاد بن کر رہ گیا۔ میری خوش بختی کہ وہ فائل میرے پاس ہی محفوظ تھی۔ گھریلو نامساعد حالات کی وجہ سے ہمیں اپنے پرانے گھر سے شفٹ کرنا پڑا اور کتابوں کو بحفاظت سنبھالنے کے لئے راشن کی بھوریوں میں قید کرنا پڑا۔ ''کہکشان گروپ'' کی فائل بھی اسی بوری کی زنیت بن گئی۔ جب فائل کو بوری سے آزادی نصیب ہوئی تو وہ کہانی پھر میرے سامنے جلوہ گر ہوئی۔ کہانی کسی اور پنڈت کی نہیں بلکہ ریاست کے معروف افسانہ نگار اور ڈراما نگار وریندر پٹواری کی تھی۔

جوں جوں میری دلچسپی اردو افسانے کے تیئں بڑھتی گئی، میں نے وریندر پٹوری صاحب کے کئی افسانے پڑھے۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جب میں نے ہمت کر کے وریندر پٹواری کو خط لکھا، جس کا جواب انہوں نے بڑے پیار اور شفقت سے دیا۔ ساتھ ہی پڑھنے کے لئے کچھ افسانے بھی ارسال کئے۔ جن کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ پٹواری صاحب کے ہمہ جہت موضوعات زندگی سے بہت قریب ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی ایک کہانی کو اپنی کتاب ''جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے'' میں بھی شامل کیا۔ ان ہی دنوں میں نے پٹواری صاحب کے ڈراما مجموعہ ''انسان'' کا تبصرہ بھی کیا۔ اس طرح پٹواری صاحب کی تخلیقات سے مستفید ہوتا رہا۔

پٹواری صاحب کی شخصیات کا اندازہ مجھے تب ہوا جب ماہنامہ ''شاعر'' نے

گوشہ پٹواری شائع کیا۔ گوشہ میں کئی تنقیدی مضامین ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھے گئے تھے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں مقتدر ادیبوں نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ پٹواری صاحب کے موضوعات اسلوب و بیان کے حوالے سے اپنے ہم عصروں سے مختلف ہی نہیں بلکہ کئی معنوں میں آگے ہیں۔ کتابوں کے عنوانات دیکھ کر میں حیرت میں پڑھ گیا کہ انجینئر نگ شعبہ سے تعلق رکھنے والا شخص اتنی فرصت کہاں سے لاتا ہے کہ انیٹ گارے کی عمارتوں کے نقشے کھنچتے کھنچتے ڈھیر سارے افسانوں کے محل تعمیر کرتا ہے۔ ان مجموعوں میں فرشتے خاموش ہیں (۱۹۸۱)، دوسری کرن (۱۹۸۶)، بے چین لمحوں کا تنہا سفر (۱۹۸۸)، آواز سرگوشیوں کی (۱۹۹۵)، ایک ادھوری کہانی (۲۰۰۲)، اُفق (۲۰۰۳)، دائرے (۲۰۱۰)، آفتوں کے دور میں (۲۰۱۱) اور لالہ رخ (۲۰۱۳) شامل ہیں۔ کشمیری میں ایک افسانوی مجموعہ ''علم'' (۲۰۰۷) بھی شائع ہوا ہے۔ مزید اردو ڈراموں کے دو مجموعے آخری دن (۱۹۸۳) اور انسان (۲۰۰۶) قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پٹواری صاحب نے ایک خطرناک حادثے سے گزرنے کے بعد بھی اشہبِ قلم کی رفتار میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی۔ جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ تخلیقی سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے، اگر ہر حال میں جینے کا قصد کیا ہو۔ حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگست ۱۹۸۸ء میں میری کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی، بچ تو گیا تھا مگر رفتہ رفتہ میرا انجینئر نگ کا پیشہ ڈوبتا گیا۔ میں چند سال بعد نہ بول سکا نہ پھر سکا۔ ہاں، علم کی دیوی نے میرے ہاتھ میں قلم اور سامنے قرطاس رکھا۔ میں لکھتا رہا اور لکھتا رہوں گا۔ دعا کرتا رہتا ہوں کہ میری آخری سانس تک میرے ہاتھ میں قلم رہے اور قرطاس سمیٹنے والا کوئی میرا قدرداں ہو۔''

پٹواری صاحب آجکل اپنے بیٹے کے ساتھ قاہرہ میں رہائش پذیر ہیں۔

فیس بک کی وساطت سے پوری ادبی دنیا سے جڑے ہیں۔ یہاں تک کہ عمر مجید کی برسی پر انہوں نے اپنے تاثرات بھی ارسال کئے، جو کشمیر عظمیٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب تو ان کا معمول بن گیا ہے کہ فیس بک کے ذریعہ اپنے تاثرات پیش کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ماضی کی کچھ تصویریں بھی چسپاں کرتے رہتے ہیں اور جب کوئی کشمیری اپنے تاثرات پیش کرتا ہے تو پٹواری صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ شاید اپنی مادری مٹی کے تئیں جو احساس ایک مہاجر کو ہوتا ہے وہی کیفیت پٹواری صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ اپنی تنہائی کو افسانوں کے ساتھ بانٹتے ہیں اور ہر مہینے کسی نہ کسی رسالے میں ان کا افسانہ ضروری ہوتا ہے۔ جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ایک جینوئن تخلیق کار جسمانی کمزوریوں سے بالاتر ہو کر دنیا کے کسی بھی کونے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہے جس کا بین ثبوت پٹواری صاحب کا تازہ افسانوی مجموعہ ''لالہ رخ'' ہے۔ جس میں پچاس افسانوں کا ایک انتخاب شامل ہے۔ جن کا مطالعہ ایک طویل مضمون کا متقاضی ہے جو میرے لئے مختصر کالم کے دائرے میں رہ کر ممکن نہ تھا۔ لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کہ پٹواری صاحب جس شایانِ شان داد و تحسین کے مستحق تھے وہ ان کو نہیں ملی۔ شاید یہ ہمارے ادبی منظر نامے کا المیہ ہے کہ پٹواری صاحب جیسے جینوئن تخلیق کاروں کو زندگی میں فراموش کر دیتے ہیں اور مرنے کے بعد مرتبے چڑھانے کی روایتی رسم نبھاتے ہیں جو زندہ قوموں میں معیوب مانا جاتا ہے۔

......●......

غیر ریاستی ادیبوں کے کارنامے

بار ہا میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مقامی ادیبوں اور نقادوں کے بجائے غیر ریاستی ادیبوں نے ہمارے یہاں اکثر و بیشتر سنجیدہ اور معیاری کام کیا ہے، جس کی نظیر بہت مشکل سے ملتی ہے۔ پروفیسر محی الدین قادری زور نے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کی بنیادیں مستحکم کیں، ساتھ ہی مقامی ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ قاضی غلام محمد کا شعری مجموعہ ''حرف شیریں''، پروفیسر مخمور بدخشی کا افسانوی مجموعہ ''نیل کنول مسکائے'' اور پروفیسر حامدی کاشمیری کی تنقیدی کتاب ''ناصر کاظمی کی شاعری'' کو ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد سے شائع کروایا۔ علی جواد زیدی نے کلچرل اکادمی کی زمام اقتدار سنبھالتے ہی ''شیرازہ'' کے نام سے ایک تحقیقی اور معیاری رسالہ جاری کیا، جو آج نصف صدی ہونے کے بعد بھی شائع ہوتا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمان نے جمالیات کی بوطیقا کشمیر میں ہی دریافت کی، انہوں نے مقامی شعراء اور ادیبوں کی کتابوں پر کئی تعارفی مضامین تحریر کیے۔ مظہر امام نے دوردرشن اور ریڈیو کے توسط سے ایک اچھا خاصا ادبی ماحول پروان چڑھایا، انہوں نے ریاست کے شعراء پر ایک طویل مضمون بھی لکھا ہے جو حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اقبال انسی ٹیوٹ کا بیج ہی نہیں بویا بلکہ اس کو دنیا کے اقبال شناسوں تک بھی پہنچایا۔

کمالؔ احمد صدیقی، زبیر رضوی، فیاضؔ رفعت اور کے کے نیر جیسے اصحاب علم وفن نے ریڈیو کی نشریات کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا۔ آفاق احمد نے ڈراما اور افسانے لکھ کر یہاں کی اردو نثر میں بہت اضافہ کیا۔ پروفیسر قدوس جاوید عمر بھر کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ سے منسلک رہے۔ ان کے سینکڑوں طالب علم کالجوں اور سکولوں میں اردو کی بقا کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اکبر جے پوری اور شبیب رضوی نے پوری زندگی کشمیر میں گزاری۔ انہوں نے یہاں کی ادبی محافل کی رونق ہی نہیں بڑھائی بلکہ مقامی شعراء کی نک سک کو بھی کسی حد تک سنوارا۔ اسی قبیل کے سرخیل پروفیسر عبدالقادر سروری ہیں جنہوں نے ریاست کے ادبی منظر نامے کی صحیح ترجمانی ''کشمیر میں اردو'' جیسی گراں قدر کتاب لکھ کر کی ہے۔ موصوف نے کشمیر میں نو سال رہ کر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک غیر کشمیری نے ریاست کی ادبی تاریخ کو جس مدلّل اور مفصّل طریقے سے تحریر کیا ہے وہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مواد کی چھان پھٹک، حفظ مراتب کا خیال اور تاریخ کی کڑیوں کو ملانا بڑا جوکھم بھرا کام ہے۔ سروری کے لئے یہ کام اس لئے ممکن ہوا کیونکہ انہیں تاریخ نویسی کا خاصہ تجربہ تھا۔ انہوں نے کئی سال پہلے اردو زبان وادب کی ابتداء اور ارتقاء کے حوالے سے ایک ضخیم ادبی تاریخ مرتّب کی تھی۔ اس لئے انہیں مواد کو توجیہ اور تشریح کے ساتھ تحریر کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اردو کے سرکردہ محقّق، نامور نقّاد، ماہرِ لسانیات اور مستند تاریخ دان تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹ راگست ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ سرور سلطان قدس سرہ کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے کشمیر ہوتے ہوئے دہلی آگئے تھے۔ بعد میں ان کی اولاد عالم گیر کے عہد میں دکن چلی آئی۔ عالم گیر کے عہد سے اس خاندان کے افراد دکن ہی

میں رہ گئے ۔سروری صاحب نے ابتدائی تعلیم والد صاحب سے گھر میں ہی پائی ۔ بی۔اے، ایم ۔اے اور ایل ایل بی کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے تعینات ہوئے ۔یونیورسٹی میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید کا بھی شغف جاری رہا، جس کے نتیجے میں ''جدید اردو شاعری'' (۱۹۲۹ء) کے چھ ایڈیشن، دنیائے افسانہ (۱۹۲۷ء)، کردار اور افسانہ (۱۹۳۵ء)، حیدر آباد کی تعلیمی ترقی (۱۹۳۴ء)، دنیا کے شہکار افسانے ،قدیم افسانے ، پھولبن (۱۹۳۹ء)، سراج سخن، کلیات سراج (۱۹۴۰ء)، قصہ بے نظیر (۱۹۳۸ء)، اردو مثنوی کا ارتقاء (۱۹۴۰ء)، سراج اور ان کی شاعری (۱۹۴۱ء)، مراۃ الاسرار، شاہ الدین (۱۹۴۴ء)، مہتاب سخن، اردو کی ادبی تاریخ (۱۹۵۹ء) جیسی کتابیں منظر عام پر آئیں۔عثمانیہ یونیورسٹی میں مختلف عہدوں پر اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے صدرِ شعبۂ اُردو وفارسی سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر سروری کی مشہوری کا یہ عالم تھا کہ انہیں عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۶۲ء میں جموں وکشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر تعینات کیا گیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے درس وتدریس کے علاوہ تاریخ اور تنقید کے حوالے سے بہت کام کیا۔جن میں ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ''، کشمیر کے دو بھائی اردو ادیب ''اور ''کشمیر میں اردو (تین جلدیں) خصوصیت کی حامل ہیں۔ ''کشمیر میں اردو'' کے موضوع پر کئی سال محنت شاقہ سے خوب مواد جمع کیا اور ۱۹۷۰ میں مسوّدہ مکمل کیا۔سروری صاحب کی شدید خواہش تھی کہ یہ مسودہ کلچرل اکیڈیمی شائع کرے، لیکن جب مسودے کو کتابی شکل دینے کی باری آئی تو ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔جس کے باعث مسودہ کی اشاعت تاخیر کی شکار ہوگئی۔سروری صاحب کو جواہر نگر راجباغ میں دفن کیا گیا۔اس طرح انہوں نے کشمیر میں ہی سپرد خاک ہوکر اپنے پیش رو

پروفیسر محی الدین قادری زورؔ کی روایت کو برقرار رکھا، جن کی آخری قیام گاہ دستگیر صاحب خانیار کے آستانہ عالیہ کے صحن میں واقع ہے۔

''کشمیر میں اردو'' قریباً بارہ سوصفحات پر مشتمل ادبی کارنامہ ہے۔ کلچرل اکیڈیمی نے اس ضخیم مسودے کو تین جلدوں میں شائع کیا۔ کتاب کی ترتیب، تہذیب اور حواشی ریاست کے نامور محقق اور نقاد جناب محمد یوسف ٹینگ نے لکھے ہیں جو ان دنوں اکیڈیمی کے سیکریٹری تھے۔ کتاب کی پہلی جلد ۱۹۸۱ء میں، دوسری جلد ۱۹۸۲ء میں اور تیسری جلد ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کی پہلی جلد آغا حشر کاشمیری کی صد سالہ پیدائش کے موقعے پر شائع کی گئی۔ ٹینگ صاحب پہلی جلد کے ابتدائیہ میں مسودے پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

> ''سروریؔ صاحب کی وفات کے بعد یہ بارِ امانت بہت دنوں تک ہمارے آرکائیوز میں ہی پڑا رہا۔ لیکن اس دوران ہم نے بہت سے صاحبانِ فکر ونظر سے رجوع کرلیا اور ان سے مشورے حاصل کئے۔ چنانچہ اس جلد کے مختلف حصوں کی نظر ثانی کے سلسلے میں ہم نے پروفیسر محی الدین حاجنی، ڈاکٹر شمس الدین احمد، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، قاضی غلام محمد، پروفیسر سیوا سنگھ، راقم الحروف (محمد یوسف ٹینگ) اور شری جتندر شرما سے رجوع کیا اور جہاں جہاں واقعاتی غلطیاں نظر آئیں یا جن مقامات پر بہتر معلومات حاصل ہوئیں، انہیں سروریؔ صاحب کے اصل مسوّدے کے متن سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بغیر حاشیوں کی صورت میں پیش کردیا''۔

وقت کا تقاضا ہے کہ جس کام کو سروری مرحوم نے ۱۹۷۰ء تک پہنچایا ہے اس

کو مکمل کرنے کے لئے کسی ایسے جیالے کی ضرورت ہے جو اس کام کو سنجیدہ طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچائے۔حال ہی میں جاوید انور نے ،جن کا تعلق بنارس سے ہے، نے کشمیر کے شعراء پر ایک تنقیدی کتاب ''کشمیر کے چند اردو شعراء'' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔جس کو دیکھ کر پھر مجھے یہی سوال ستاتا ہے کہ یہاں زیادہ کام غیر ریاستی ادیبوں نے ہی کیا ہے،شاید اس سوال کا جواب کشمیر کے کہنہ مشق نقاد،شعراء اور ادباء مجھ سے زیادہ بہتر طور دے سکتے ہیں۔

......●......

اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

دسویں جماعت کی ''گلستان اردو'' میں پہلی بار یہ پڑھا کہ ادب اور سائنس میں کیا فرق ہے۔ دسویں جماعت کے طالب علم کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے کہ وہ ادب اور سائنس کی اصطلاحوں کو سمجھ سکے۔ جبکہ میرے نزدیک ادب کے معنی اخلاق، طریقہ اور کردار تک ہی محدود تھے۔ ایم۔اے کے دوران اساتذہ نے ''ادب'' کی اصطلاح سمجھاتے ہوئے کہا کہ ادب تین چیزیوں کا مجموعہ ہے، جس میں جذبات، احساسات اور تجربات شامل ہوتے ہیں۔ آگے چل کر میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ نظریاتی طور پر لٹریچر ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی ہوتا ہے۔ گویا یہ باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہوگئیں۔

حال ہی میں ایک ٹی وی چینل پر ''ادب برائے سیاست'' کے موضوع پر بحث ومباحثہ چل رہا تھا، جس میں حقائق کی نشاندہی بڑی بے باکی سے ہورہی تھیں کہ موجودہ دور میں ''ادب برائے سیاست'' کا رجحان عام ہورہا ہے۔ جو سوالات اس شو میں ابھارے گئے ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ کیا ایک قلمکار آگے جانے کے لئے سیاست کا سہارا نہیں لیتا، انعام پانے کے لئے کمیٹی کے ممبران کو شیشے میں نہیں اتارا جاتا، مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے منسٹر صاحبان سے شفارش نہیں کرائی

جاتی، کتاب کی رسم رونمائی میں کسی سیاست داں کو ایوان صدارت میں بٹھا کر رونق نہیں بخشتی جاتی۔ اب تو صورتحال یہ ہے کہ کتاب کا انتساب بھی سیاست زدہ ہو چکا ہے۔ فلیپ، تقریظ، پیش لفظ وہ بھی کسی ایسے بیروکریٹ سے لکھنے کا رجحان چل پڑا ہے جو مستقبل میں کوئی فائدہ پہنچا سکے۔ لابی ازم کا جال اتنا پھیل چکا ہے کہ اب ادیبوں کا دائرہ ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کے مصداق سمٹ چکا ہے۔ یک نفری تنظیمیں پریس نوٹ تک محدود ہیں اور اپنے ذاتی منفعت کے لئے لٹریچر کے ٹائٹل کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ایسی کئی باتیں ہیں جن کا عمل دخل صرف اور صرف سیاست کی مرہون منت ہے۔ اسی لئے موجودہ دور میں جو نظریہ پنپ رہا ہے وہ صرف ''ادب برائے سیاست'' ہے۔

ابھی ادب میں سیاست کی بیجا مداخلت کی بات چل رہی تھی کہ مجھے اردو کے نامور شاعر فراق گھورکھپوری کا وہ واقعہ یاد آیا جس میں انہوں نے حسن نعیم کے شعری مجموعے ''حرفِ دل'' کا مقدمہ لکھنے کی حامی بھری۔ جب حسن نعیم نے فراق صاحب سے استفسار کیا کہ مجھے وہ اپنے تاثرات سے نوازیں جو انہوں نے میری کتاب کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ فراق صاحب نے درجواب کہا کہ بھائی جلدی کیا ہے پہلے میرے کچھ تازہ اشعار سنو۔ پھر کیا تھا کہ فراق صاحب اپنے اشعار سنانے میں منہمک ہو گئے اور حسن نعیم داد دیتے رہے۔ اس طرح یہ سلسلہ تین دنوں تک چلتا رہا۔ جب فراق صاحب نے ڈھائی ہزار اشعار سنانے کے بعد حسن نعیم سے پوچھا کہ اردو کا بڑا غزل گو شاعر کون ہے تو حسن نعیم نے برجستہ جواب دیا کہ میر تقی میر۔ یہ سنتے ہی فراق صاحب کے چہرے سے ہوائیاں اُڑنے لگیں، پھر مزید پوچھا اب اگر دو نام لینے ہوں تو کس کس کا نام لوگے، حسن نعیم نے میر کے بعد غالب کا نام لیا۔ پھر کیا تھا فراق صاحب نے تعداد پانچ تک بڑا دی، لیکن پھر بھی انہوں نے فراق کا نام نہیں لیا۔ فراق

صاحب کو غصہ آیا اور کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ اسی سخن فہمی اور سخن دانی کی بنیاد پر میں آپ کی کتاب کا مقدمہ لکھوں۔

اس واقعہ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ اب ادیب سیاست کا سہارا لے کر اپنی کرسی پر براجمان رہنا چاہتا ہے، اس بات کا اعتراف وارث علوی نے کئی سال پہلے کیا تھا کہ اب ادب میں بھی بڑے بھائی لوگوں کا سکہ چلتا ہے اس بات کی تصدیق مرحوم علی محمد لون کے اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ڈاکٹر بشیر گاشؔ کے نام لکھا ہے کہ "ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ادب یا شاعری کے میدان میں ہماری ہمسری کا دعویٰ کرے، اس سے ہماری اہمیت اور شہرت دونوں میں خلل پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے، ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ آپ اور آپ جیسے دوسرے نوجوانوں کو ادب کے خارزار اور شاعری کے ریگزار سے ڈراتے رہیں، آپ کو راہِ ادب سے بھٹکائیں، آپ کے دل میں وسوسہ، ڈر، واہمے، اور شکوک پیدا کریں، اچھی بری کوشش اور اچھے برے عمل میں کیڑے نکال کر آپ کو (frustrate) کریں۔ بھئی ایسا نہ کریں تو ہمارے نام لیواؤں میں پھر کون رہے گا۔ آپ نے بڑھ کر بازی جیت لی تو ہم اپنی ہار پر مطمئن کیسے ہوں گے؟"

اس میں دو رائے نہیں کہ اب لٹریچر میں انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک سیاست کا عمل دخل ہو چکا ہے۔ پھر بھی حتی الامکان اک قلم کار کو چاہئے کہ وہ سیاست سے دامن کشا ہو کر علم وادب کا دامن پکڑے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو تخلیقی عمل کے لئے وقف رکھیں۔ کیونکہ قلم کار اپنے ادبی قد وقامت پر زندہ رہتا ہے نہ کہ سیاست کے ہتھ کنڈوں سے۔ بقول شاعر

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانے
اپنا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

......●......

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

۲۰۰۴ء کی بات ہے کہ شعبہ اردو کی طرف سے مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں دو دنوں کا سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کو کامیاب بنانے کیلئے شعبہ کے سبھی ریسرچ اسکالروں اور ایم۔ اے کے طلباء کو صدرِ شعبہ کی ہدایات تھیں کہ مہمانوں کا استقبال گرم جوشی سے کیا جائے۔ میں اور میرے دیگر ساتھی پیلے رنگ کے بیج لگائے گاندھی بھون کے سامنے مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑے رہے۔ آہستہ آہستہ مہمان ادیب وشعراء تشریف لا رہے تھے کہ اچانک گاندھی بھون کے سامنے ایک ماروتی کار رُکی اور اس میں سے ایک صاحب ہشاش وبشاش، بارعب انداز میں قراقلی اور اچکن پہنے بڑے طمطراق سے نیچے اترے۔ ریسپشن پر موجود سبھی افراد ایک ساتھ ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے اُمڈ پڑے۔ پروفیسر صاحبان اور دوسرے اساتذہ دوڑے دوڑے ان سے بغل گیر ہونے لگے۔ اساتذہ حضرات سرگوشی کرتے ہوئے ایک دوسرے سے گویا تھے کہ پروفیسر موصوف ایک بڑے عرصے کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں داخل ہوئے ہیں جو ہمارے سمینار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہم لوگوں کے لئے یہ ایک عجیب معمہ تھا کہ یہ کونسی سی شخصیت ہیں جن کے لئے سب دیوانہ وار ان سے مصافہ ومعانقہ کرنے میں پہل کر رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ موصوف پروفیسر اکبر حیدری ہیں جن کی ۸۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی

ہیں۔ان کی تحریریں خالص تحقیقی نوعیت کی ہوتی ہیں۔انہوں نے اردو کے اساتذہ شعراء میں میرتقی میر،مرزاغالب،میرحسن،میرانیس،مرزادبیراور علامہ اقبال پر بہت وقیع کام کیا ہے۔جس کے لئے انہیں بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری نے افتتاحی تقریب کے صدراتی خطبہ کے دوران جذباتی ہوتے ہوئے کہا کہ آج میں کئی برسوں کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے کسی سمینار میں بلایا گیا ہوں جبکہ بین الاقوامی سمیناروں میں اکثر وبیشتر یاد کیا جاتا ہوں۔مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب شعبۂ اردو میں لیکچرار کی اسامی کے لئے مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔میں نے اپنی مطبوعات ایک ٹانگہ میں بھر کر لائی تھیں لیکن افسوس کہ مستحق امیدوار ہونے کے باوجود مجھے ڈراپ کیا گیا اور وہاں ایک ایسے امیدوار کی تقرری ہوئی جس نے دوڈھائی صفحے بھی تحریر نہیں کئے تھے۔اس کے برعکس جب میں حیدر آباد کی ایک لائبریری میں دنیا ومافیہا سے بے خبر،گرد وغبار اور دھول سے اٹی ہوئی ایک چٹائی پر بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ اچانک لائبریری کے ریفرنس سیکشن میں والئ ریاست تشریف لائے۔انہوں نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر آنے کی پیش کش کی۔جب میں دونوں واقعات پر سوچتا ہوں کہ ایک طرف اپنی سرزمین پر مجھ سے غیروں کا سا سلوک روا رکھا گیا اور دوسری طرف غیر ریاستوں میں میری اتنی پذیرائی ہوئی ہے کہ میرا جی ہی نہیں چاہتا کہ میں کشمیر میں رہ کر زندگی گزاروں۔کیونکہ کشمیری ہمیشہ ''پردا رُک'' رہا ہے۔

سمینار ختم ہوتے ہی میں نے اپنی نوٹ بک پر ان سے آٹوگراف کی خواہش ظاہر کی۔مسکراتے ہوئے کہنے لگے بھئی میں اتنا بڑا ادیب نہیں کہ تم میرا آٹو گراف لے لو۔میں نے اصرار کیا تو ہنستے ہوئے نوٹ بک پر اپنے دستخط علامہ اقبال کے ان اشعار کے ساتھ ثبت کئے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

ایم۔فل میں اپنے موضوع ''اردو کے ضرب المثل اشعار'' کے مواد کی چھان پھٹک کے دوران مجھے معروف ادبی رسالہ ''نقوش'' کی فائل کی ورق گردانی کا موقعہ ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ محمد طفیل نے تنِ تنہا ''نقوش'' کے ضخیم نمبر کیسے ترتیب دیئے ہیں۔ان خاص نمبروں میں رسول ﷺ نمبر (۱۳ جلدیں)، منٹو نمبر، لاہور نمبر، اقبالؔ نمبر، مکاتیب نمبر (۳ جلدیں)، غالبؔ نمبر، ادب عالیہ نمبر، شخصیات نمبر اور میر نمبر بہت ہی مشہور ہوئے۔لیکن جب میں نے دیکھا کہ میرؔ نمبر کی ترتیب وتدوین کی جگہ محمد طفیل نہیں بلکہ ڈاکٹر اکبر حیدری لکھا ہوا ہے۔حیدری صاحب نے میر پر جو معیاری کام کیا ہے اس کو محمد طفیل نے ''نقوش'' کے پورے ''میرؔ نمبر'' میں سمویا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حیدری صاحب کس پایہ کے محقق تھے۔

چند سال قبل سہ ماہی ''بزمِ ادب'' میں میرا ایک مضمون ضرب المثل اشعار کے حوالے سے شائع ہوا، جس میں، میں نے میر تقی میرؔ کے کچھ اشعار ''آبِ حیات'' کا حوالہ دے کر قلم بند کئے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب میرؔ نے دلی سے ہجرت کی تو انہوں نے لکھنؤ پہنچتے ہی ایک مشاعرے میں شرکت کے دوران یہ اشعار پڑھے؛

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روز گار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

پروفیسر موصوف نے میرے مضمون کی سراہنا کرتے ہوئے مندرجہ بالا اشعار کے بارے میں اپنی تحقیقی رائے کچھ اس طرح بیان کی تھی۔

''یہ اشعار کلیاتِ میرؔ میں کہیں درج نہیں ہیں۔ محمد حسین آزادؔ دہلوی نے پہلی مرتبہ ''آبِ حیات'' میں میرؔ کے نام سے منسوب کیے ہیں۔ ابوالکلام آزادؔ، رام بابو سکسینہ (مصنف تاریخِ ادبِ اردو) اور سردار جعفری وغیرہ نے آزادؔ دہلوی کی تردید میں ان اشعار کو میرؔ کی تصنیف سے انکار کر دیا ہے۔ جب میں ۱۹۷۳ء میں شعیب محمدیہ کالج گیا۔ کالج کے پرنسپل ابو محمد صاحب تھے، انہوں نے مخطوطاتِ میر دیکھنے کی اجازت دے دی۔ ایک بیاض قدیم نمبر ۱۰ کے تحت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں میرؔ کی مثنوی (خواب وخیال) کے علاوہ میرؔ کے کچھ غیر مطبوعہ اشعار بھی درج تھے۔ مثنوی کے آخر میں اول رجب ۱۲۱۶ھ بمطابق نومبر ۱۸۰۱ء کی تاریخ ثبت تھی۔ میرؔ اس کے بعد ۹ سال تک زندہ رہے۔ تاریخ کتابت کے بعد میرؔ کا مذکورہ قطعہ درج ہے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے۔

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ نیم ماہ

آخر پر میں یہی بات کہوں گا کہ مقامی سطح پر جو پذیرائی پروفیسر حیدری کو ملنی چاہئے تھی وہ نہیں ملی۔ شاید اسی لئے وہ ہمیشہ ریاست کے اربابِ اختیار سے کبیدہ خاطر رہے۔

.....●.....

نگری نگری پھرا مسافر

ابتداء سے جن شعراء کو پڑھتے ہوئے مجھے کوفت محسوس ہوتی تھی، ان میں ن،م، راشد اور میراجی سرفہرست ہیں۔ ان کے نام جدید شاعری کے ساتھ اس طرح جڑے ہیں جیسے ایک سکے کے دُورخ۔ برسوں بعد پتہ چلا کہ میراجی نسلاً کشمیری تھے۔ ایک کشمیری ہونے کے ناطے مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اردو کے رجحان ساز شاعر کا تعلق ہماری سرزمین سے ہے۔ بارہا چاہا کہ میراجی کو پڑھوں۔ لیکن معاملہ ہمیشہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ ایک تو ان کا کلیات آسانی کے ساتھ بازار میں دستیاب نہیں تھا دوسرا اگر کہیں سے کتاب میسر ہو بھی جاتی تو اس کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ جب پوری اردو دنیا میں یہ خبر پھیل گئی کہ میراجی کی پیدائش کو پورے سو سال ہو گئے ہیں تو ہر طرف میراجی پر گفتگو ہونے لگی۔ رسائل اور جرائد میں میراجی کی زندگی اور شاعری پر مضامین لکھے جانے لگے۔ مجھے بھی یہ شوق چرایا کہ میں بھی میراجی کے بارے میں کچھ پڑھوں۔ تلاش بسیار کے بعد ''میراجی ...... ایک مطالعہ'' میسر ہوئی، جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کی ہے۔

میراجی کا اصلی نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا۔ ان کی پیدائش منشی محمد مہتاب الدین کے ہاں ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء لاہور میں ہوئی۔ پہلے ''ساحری'' تخلص کرتے تھے لیکن ایک بنگالی لڑکی

''میرا سین'' کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو کر میرا جی کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرا جی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کی ذات ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ ان کے خدوخال اور طور طریقے مختلف تھے۔ جمیل جالبی میرا جی کا خاکہ کھینچتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میرا جی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ ان کی ذات عام آدمی کے لئے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کا حلیہ اور ان کی حرکات وسکنات ایسی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا انہوں نے سلسلہ مُلامتیہ میں بیعت کرلی ہے۔ لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں، گلے میں ایک سوایک موٹے دانے کی دو گز لمبی مالا، شیروانی جس کی کہنیاں ہمیشہ پھٹی ہوئی ہوتی تھیں، اوپر نیچے بیک وقت تین پتلونیں، اُوپر کی جب میلی ہوگئی اور نیچے کی اوپر اور اوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کچھ دُھلے ہوئے چیتھڑے، ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دیسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہومیو پیتھک دوائیں، کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ بغل میں دابے بڑی سڑک پر پھرتا تھا اور چلتے ہوئے ہمیشہ ناک کی سیدھ دیکھتا تھا۔ تاک جھانک کو وہ کفر خیال کرتا تھا۔ بازار میں کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر، اپنے محلے اور اپنی سوسائٹی کے ماحول کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتا تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے لئے شعر کہیں گئے۔''

میرا جی کی شخصیت پر بودلیر کے گہرے اثرات تھے۔ دونوں احتجاجی لہجہ رکھتے تھے۔ دونوں نے سماج کے خلاف احتجاج کرنے کا اپنا مخصوص طریقہ اپنایا تھا۔ بودلیر نے سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنا سر منڈوا کر اس پر ہرا رنگ بھر دیا

اوراحتجاج کی عبارت سر پرلکھ کراور ایک کیکڑے کو دھاگے میں باندھ کر پیرس کے ایک ریستوران کے باہر کھڑا ہوگیا اور کیکڑے سے مخاطب ہو کر احتجاج کیا۔ اخلاق احمد دہلوی میرا جیؔ کے اسی نوعیت کے ایک واقعہ کو بیان کرتے ہیں کہ میراجیؔ نے دلی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چپلن والا جوتا بھی بدل ڈالا اور کلارک گیبل کی وضع کی مونچھیں بھی حذف کرادیں تو ان سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ سوٹ بوٹ پہنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میراجیؔ کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے لیکن جب پوری طرح ٹپ ٹاپ ہوکر انہیں نے سر پر استرا پھیر دیا اور چاند سے سر پر Happy New Year پینٹ کروایا اور مالائیں جو قمیض کے اندر رہتی تھیں۔ باہر کوٹ کے کالر پر پہن لیں تو ان کے مقربین کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میراجیؔ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔

میراجی نے زندگی کی کل سینتیس بہاریں دیکھیں۔ قلیل عمر پانے کے باوجود انہوں نے بہت لکھا۔ ان کا کلیات جو ڈاکٹر جمیل جالبیؔ نے مرتّب کیا ہے، ۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تصانیف میں جہاں مشرق ومغرب کے نغمے (۱۹۵۸)، اس نظم میں (۱۹۴۴)، نگارخانہ (۱۹۵۰)، خیمے کے آس پاس (۱۹۶۴) شامل ہیں۔ میراجی کے گیت (۱۹۴۳)، میرا کی نظمیں (۱۹۴۴)، گیت ہی گیت (۱۹۴۴) پابند نظمیں (۱۹۶۸ء)، اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری کے وہ مجموعے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اس راستے پر ڈال دیا جس پر وہ آج گامزن ہے۔

میراجیؔ نے کم عمری میں کئی ادبی معرکے سر کیے۔ ان کی شخصیت میں سیماب پن خاصا موجود تھا۔ اسی لئے وہ کسی نظریئے کو حتمی نہیں مانتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ خود اپنے مطالعے اور مشاہدے کے بارے میں لکھا ہے:

''مشاہدے کے لحاظ سے اگر چہ بحیثیتِ مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا۔لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی، اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔مطالعے کے لحاظ سے اس زمانے میں نہ صرف مغربی، انگریزی اور فرانسیسی ادب نے میری رہنمائی کی بلکہ مغربی تفکر اور سائنس نے بھی اپنا اپنا اثر کیا۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشرقی روایات اور صدیوں کے اثاثے سے بیگانگی رہی۔ویشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا۔ اس کی ادبی روایات بھی کچھ اس انداز سے بروئے کار آئیں کہ دل و دماغ ایک جیتا جاگتا برندابن بن کر رہ گیا۔سرسری طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مشرق سے مہارانی میرا بائی اور چنڈی داس نے مجھ پر اثر کیا اور مغرب سے والٹ وٹمن، ڈی ایچ لارنس، سٹیفانے میلارمے اور چارلس بادلیر نے، مفکرین میں سے چارلس ڈارون، سگمنڈ فرائڈ، سر جیمز جینیر، آئن سٹائن (جن کے نظریے کو میں نہیں سمجھ سکتا) ہیولاک ایلس اور رابندر ناتھ ٹیگور قابلِ ذکر ہیں۔اردو شعراء کی فہرست یہ ہے امیر خسرو، انشاء، میر، غالب، حفیظ جالندھری، عبدالرحمان بجنوری، مولوی عظمت اللہ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔''

اکثر کہا جاتا ہے کہ جب میراجی کا آخری وقت آیا تو اس کے سرہانے بودلیر

کی کتاب ''The Defeat of Baudliare'' موجود تھی۔ نوجوان افسانہ نگار ناصر ضمیر نے حال ہی میں میراجی کی شخصیت پر ایک افسانہ ''میرا متر میراجی'' تحریر کیا اور افسانے کا اختتام اس طرح کیا:

> ''لحد نے اسے اپنی گود میں لیکر احتیاط سے سنبھالا، جیسے مٹی کو بھی پتا تھا کہ نگری نگری پھرنے والا یہ مسافر صرف ساڑے سینتیس سال کی عمر میں ہی کافی تھک چکا ہے''۔

......●......

کاش میں ترجمہ کر پاتا

لڑکپن میں ہمارے ماما جی، جنہیں ہم پیار سے گاشہ ماما کہتے تھے، جب بھی ہمارے یہاں آتے تو میں کسی کمرے کے کونے میں چھپ جاتا۔ ان کی عادتِ ثانیہ تھی کہ وہ مجھے پکڑ کر ایک انگریزی محاورہ ''Blood is thicker than water'' کا ترجمہ کرنے کو کہتے۔ میں شش و پنج میں مبتلا ہو کر ہر بار یہی کہتا کہ ''خون پانی سے پتلا ہے''۔ وہ میرا جواب سن کر قہقہہ مار کر چلے جاتے اور آئندہ اس کا صحیح ترجمہ کرنے پر زور دیتے۔ میں حیران و پریشان سوچتا رہتا کہ آخر اس کا صحیح ترجمہ کیا ہوگا۔ پھر اسے حسنِ اتفاق کہیے یا آزمائش کی گھڑی، کہ میٹرک کے انگریزی پرچہ میں ترجمہ کے حوالے سے ۱۵ نمبروں والا ایک سوال ہوا کرتا تھا اور میری قسمت دیکھئے کہ مذکورہ محاورے کا متن اب سوال کی صورت میں سامنے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور ماما جی کا چہرہ قہقہہ مارتے ہوئے میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا، جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ بھتیجے میں نے نہیں کہا تھا کہ اس کا صحیح ترجمہ تمہارے کام آئے گا۔ پورا پرچہ مکمل کرنے کے بعد صرف یہی ایک محاورہ رہ گیا تھا جس کا اردو ترجمہ کرنا ابھی باقی تھا اور وقت کی گھڑیاں ٹک ٹک کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اب دو منٹ رہ گئے ہیں۔ جب ممتحن نے میری بے چینی کا اندازہ لگایا تو ازراہ انسانیت مجھ سے گویا ہوئے کہ اپنا اپنا ہوتا اور غیر غیر۔ بس پھر کیا تھا میں نے اشارہ سمجھ لیا اور

انگریزی جملے کا صحیح ترجمہ ہمیشہ کے لئے میرے ذہن ودل میں رچ بس گیا۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ ترجمہ ایک مشکل فن ہے یہاں تک کہ ترجمہ کے لئے ''دانتوں میں پسینا آنا'' محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتا ہو۔ کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج اور معیار ہوتا ہے۔

میرے ایک قریبی دوست عابد احمد، جو کلچرل اکادمی سے نکلنے والا ''شیرازہ'' انگریزی کے مدیر ہیں، نے حال ہی میں جموں سے تعلق رکھنے والے منفرد لب و لہجے کے نوجوان اردو شاعر خالد کرّار کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ''Crescendo'' کے عنوان سے کیا۔ کتاب میں نظموں کا خوبصورت اور مترنم انداز میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک زبان کو وسعت دینے کے لئے ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کے اعلیٰ اور شاہکار تخلیقات کا ترجمہ کیا جائے تاکہ زبان میں وسعت پیدا ہو سکے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ ترجمہ کی بدولت ہی دنیا کی کوئی بھی تخلیق ہو یا ایجاد ہمارے پاس پہنچ پاتی ہے۔ قرآن ہو یا انجیل مقدس، ارسطو کی بوطیقا ہو یا افلاطون کی ریاست، ہیگل و کانٹ کا فلسفہ ہو یا حکیم لقمان کی حکمت، ڈانتے کی ڈیوئن کامیڈی ہو یا علامہ اقبال کا جاوید نامہ، کبیر کے دوہے ہو یا ٹیگور کے گیت، سعدی کی حکایات ہو یا خیام کی رباعیات، موپاساں کے افسانے ہوں یا ٹالسٹائے کے ناول، انتن چیخوف کے ڈرامے ہوں یا ٹی۔ ایس ایلیٹ کی تنقید، رومی کی مثنوی ہو یا جامی کا نعتیہ کلام، بودلیرؔ کا احتجاج ہو یا سموئیل بیکٹ کا انتظار، والمیکی کی رامائن ہو یا کالی داس کی شکنتلا، فرائڈ کی نفسیات ہو یا جان کیٹس کی رومانیت، جیک دریدا کی ڈکنسٹرکشن ہو یا رولاں باتھ کی مصنف کی موت، محمود درویش کی مزاحمت ہو یا کارل مارکس کی اشتراکیت، ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہو یا فردوسی کا شاہنامہ وغیرہ غرض دنیا کی اعلیٰ پائے کی تخلیقات ترجمہ کی وجہ سے دوسری زبانوں میں منتقل ہو سکیں ہیں۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کی کشمیر کی علمی تاریخ پانچ ہزار سالوں کو محیط ہے اور

ان ہزاروں برسوں میں علم وادب، حکمت وفلسفہ اور فنونِ لطیفہ کے علمبرداروں اور تخلیقاروں کی ایک کہکشاں ہر دور میں پیدا ہوئی ہے۔ کشمیر میں سنسکرت علماء کی تاریخ چھ صدیوں پر مشتمل ہے۔ سنسکرت شعریات کو زرخیز بنانے میں جن کشمیری سنسکرت عالموں نے اہم کارنامے انجام دیئے، ان میں آنند وردھن، ابھنو گپت، اد بھٹ، رودر بھٹ، مکل بھٹ، مم بھٹ، آچاریہ ممٹ، آچاریہ چندر گن چندر وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔ فارسی دور میں غنی کاشمیری، حسن شاہ کھوہامی، خواجہ اعظم دیدمری کے کارناموں سے کون واقف نہیں۔ لل دید کے واکھ، شیخ العالم کے شروکھ، حبہ خاتون کے وژن، رسول میر کے رومانی نغمے، رحمان ڈار کی شش رنگ، مقبول شاہ کرالہ واری کی مثنوی، مہجور کی انقلابی شاعری، عبدالاحد آزاد کا احتجاجی کلام، اختر محی الدین کے افسانے، علی محمد لون کے ڈرامے، غلام رسول نازکی کے قطعات، دینا ناتھ نادم کے اوپیرا، خضر مغربی کی ظرافت، شمس فقیر، نعمہ صاحب سوچھ کرال، احد زرگر اور صمد میر کا صوفیانہ کلام، محمود گامی کی یوسف زلیخا، پرکاش رام کی رامائن، فاضل کاشمیری کی پہل کور، محی الدین گوہر کی رکھ، محی الدین حاجنی کا گریس سندگھر جیسی شاہکار تخلیقات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ کاش ہمارے یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طرز پر ایک دارالترجمہ ہوتا تو یقیناً ہم عالمی سطح پر اپنے مقامی ٹیلنٹ کی ترسیل کر پاتے اور جن لوگوں کو یہ احساسِ کمتری ہے کہ کشمیریوں نے ایسے کارنامے انجام نہیں دیئے ہیں جن کی بدولت ہم عالمی سطح پر کوئی مقام پاسکیں، وہ سراسر غلط فہمی کے شکار ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ جب میں ایک انگریزی محاورہ کا ترجمہ نہیں کر پایا اور اب انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی بدولت ایک کلک کرنے پر پلک جھپکتے ہی مطلوبہ زبان میں ترجمہ آپ کے سامنے ہوگا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اب بدلتے دور میں انسان کی افرادی قوت مشینوں سے پوری کی جائے گی۔ شاید اب میری طرح کسی کو بچپن میں ہی خفت نہیں اُٹھانی پڑے گی۔

......●......

غرورِ عشق کا بانکپن

کالج کے دنوں کی بات ہے کہ مجھے ایک دن ریڈیو کشمیر کی یووانی سروس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک پرڈوسر صاحب کے کہنے پر مجھے پروفیسر محی الدین حاجنی کے حوالے سے ایک Talk لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ نام میں نے اس وقت پہلی بار سنا، تو میں پریشان ہوا کہ حاجنی صاحب کے بارے میں کہاں سے معلومات فراہم ہوسکتی ہے۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے شیرازہ کشمیری کا حاجنی نمبر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ شیرازہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ضروری چیزیں نقل کیں اور ایک سوانحی مضموں تیار کیا۔ جب پرڈوسر نے مذکورہ Talk دیکھی تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے Talk ریکارڈ کروائی اور کالج کی راہ لی۔ پھر میں نے جب یونیورسٹی کا انٹرنس دیا، تو وہاں ایک آبجیکٹو سوال یہ تھا کہ مسدس حالی کا پہلا کشمیری ترجمہ کس نے کیا۔ میرے ذہن میں فوراً پروفیسر حاجنی کا نام آیا۔ شاید جو Talk میں نے بے شعوری میں نقل کی تھی آج میرے کام آگئی۔ کئی سالوں کے بعد جب پروفیسر حاجنی کی ۹۰ یوم پیدائش کے سلسلے میں معروف کالم نویس ڈاکٹر جاوید اقبال کا طویل مضمون پڑھا تو حاجنی صاحب کے حوالے سے میرے ذہن میں پھر وہ واقعات ابھرنے لگے جو میں نے کالج کے دنوں میں شیرازہ کشمیری سے نقل کیے تھے۔ کسی نے شاید سچ ہی کہا ہے کہ نقل کرتے کرتے کئی باتیں ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر محی الدین حاجنی وادیٔ کشمیر کے وہ فرزند ہیں جنہوں نے پوری عمر کشمیری ہونے پر فخر کیا۔ان کو کشمیر کے ہر ذرے سے اتنی محبت تھی کہ اگر کوئی نادانستہ طور پر کشمیر کے خلاف کوئی بات کہہ دیتا تو وہ برسرِ مجلس اس کے خلاف محاذ کھول دیتے۔ان کی بذلہ سنجی ،حاضر جوابی ،نکتہ رسی اور چہرا شناسی دور دور تک مشہور تھی۔ان کی شخصیت کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ مجموعہ اُضداد تھے۔اگر چہ ان کی علمی سند عربی زبان میں تھی لیکن انہیں سائینس ،سوشیالوجی ،فلسفہ،نفسیات ،تاریخ ،ریاضی اور ادبیات پر کامل دستگاہ تھی۔ذہانت کا پہلا ثبوت انہوں نے کالج کے زمانے میں ہی دیا جب انہوں نے ’’گریس سند گھر‘‘ (دیہاتی کا گھر) کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا۔جو کالج کے میگزین ’’پرتاب‘‘ میں قسط وار شائع ہوا۔اس ڈراما میں انہوں نے ایک دیہاتی کو درپیش مسائل کے ساتھ ساتھ جاگیردارنہ نظام کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ان کی اس کوشش سے دو چیزیں خاص طور پر سامنے آئیں کہ ایک حاجنی صاحب کے مستقبل میں کیا ارادے ہیں اور کشمیری زبان میں نثر کی جو کمی تھی اس کی طرف بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے۔

حاجنی صاحب ہمیشہ علم دوست مجلسوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔کسی کی کیا مجال جو بھری محفل میں ان سے ٹکر لینے کی کوشش کرتا۔ایک دن حسب معمول حاجنی صاحب کی جیب کاغذ کے پلندوں سے بھری پڑی تھیں۔محفل میں شامل ایک پروفیسر نے حاجنی صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ صفحے کھینچنے لگا۔یہ بات ان کو بہت ناگوار گزری انہوں نے پروفیسر موصوف کو یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ یہ مضمون میں نے انسائیکوپیڈیا برٹانیکا کے لئے تحریر کیا ہے۔پروفیسر نے یہ سنتے ہی استہزا یہ انداز میں کہا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا......!!۔حاجنی صاحب کو غصہ آیا انہوں نے فوراً برسرِ محفل پروفیسر کو یہ چلینج دیا کہ اگر وہ انسائیکوپیڈیا کی speeling صحیح بتاسکیں تو میں دو

مہینوں کی تنخواہ بطور انعام دوں گا۔ پروفیسر صاحب واجبی قابلیت کے مالک تھے، یہ سنتے ہی شرمندہ ہوگئے۔

حاجنی صاحب موقعہ شناس تھے ان کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ ادبی مرکز کمراز کے مشاعروں میں ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے تھے۔ جب شعراء حضرات کلام پڑھنے کے لئے ڈائس پر تشریف لاتے تو حاجنی صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہوٹنگ شروع کردیتے، جس سے شاعر نروس ہوجاتا۔ اور ساتھ ہی اونچی آواز میں فقرہ کستے کہ شاعر کو اپنے محبوب کے تیئں دلخراش صدائیں دینے دو کیونکہ اس کو محبوب نے اپنی زلفوں کا اسیر بنایا ہے، یہ سنتے ہی شاعر پسینے سے شرابور ہوجاتا۔ اب اگر کسی نے اعلیٰ پائے کا شعر سنایا تو اس کی داد بھی دل کھول کردیتے۔

حاجنی صاحب اتنے ہٹ دھرم تھے کہ وہ کسی کی نہیں مانتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی انہیں علاج کے سلسلہ میں ڈاکٹر کے پاس جانے کی صلاح دیتا تو وہ صاف مکر جاتے۔ جب اخیر وقت میں حاجنی صاحب کی صحت نے جواب دیا تو گھر والوں نے مجبوراً انہیں بے ہوشی کے عالم میں دہلی کے معروف ہسپتال جی بی پنت میں داخل کرایا۔ خوش قسمتی سے ہسپتال کا سپرنٹنڈنٹ کشمیری تھا، گھر والوں نے ان سے استدعا کی وہ مریض سے ایسے پیش آئیں جیسے حاجنی صاحب کو لگے کہ ان کا علاج کشمیر میں ہی چل رہا ہے۔ ڈاکٹر نے مریض کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا مریض ٹھیک ہوسکتا ہے لیکن ان کو دو چیزوں کا پرہیز کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ باتیں بہت کم کریں اور دوسرا تمبا کو ہمیشہ کے لئے ترک کردیں۔ حاجنی صاحب کی ضد کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے دونوں چیزیں نہیں چھوڑی۔

......●......

اُردو کے جوان مرگ شعراء

میرے ایک افسانہ نگار دوست جنید جاذبؔ ہمیشہ از راہ مذاق کہا کرتے ہیں کہ جنیوئن لوگ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے۔ مجھے اس جملے کی معنویت کا اندازہ حال ہی میں ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے والے ایک کشمیری گیت سے ہوا، جو کشمیری زبان کے معروف شاعر رسول میرؔ کا ہے۔ رسول میرؔ ڈورو شاہ آباد اننت ناگ کے رہنے والے تھے انہوں نے زندگی کی کل تیس بہاریں دیکھی ہیں۔ کم عمری میں ہی انہوں نے روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے تیز وتند عاشقانہ جذبات کا بڑے بے باک انداز میں اظہار کیا۔ جس کے لئے انہیں کشمیر کا ''کیٹس'' کہا جاتا ہے۔ دونوں شاعروں میں یہ مناسبت ہے کہ دنوں نے اپنے کلام میں عاشقانہ مضامین کو بے خوف وخطر پیش کیا اور دونوں کم عمری میں ہی (رسول میرؔ 30 سال اور جان کیٹس 26 سال) اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ اس رومانی قبیل سے تعلق رکھنے والا ایک اور اردو شاعر اختر شیرانی بھی عالمِ جوانی میں ہی اردو دنیا کو سوگوار کر کے چلے گئے۔ جب اردو شاعری کا تھوڑا سا بھی مطالعہ کرتے ہیں تو جوان مرگ شعراء کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ (پ:1456ء، م:1499ء =43 سال) اردو کے

پہلے صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔اقتدار کی وجہ سے ان کا عالم جوانی میں ہی قتل ہوا۔انہوں نے اردو کی ہر شعری صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا ضخیم کلیات ''کلیاتِ قلی قطب شاہ'' مرتّب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔میر حسنؔ (پ: 1742ء،م:1786ء=44سال) مثنوی ''سحر البیان'' کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔اس مثنوی کو تخلیق کرنے کے ایک سال بعد ہی وہ فوت ہو گئے اور قادر الکلام شاعر مصحفیؔ نے مادہٗ تاریخ وفات ''شاعرِ شیریں بیاں'' کہہ کر نکالا۔ان کی تصانیف میں ''تذکرہٗ الشعراء'' اور ایک دیوان شامل ہیں۔نسیم لکھنوی (پ:1811ء: م:1844ء=33سال) کشمیری برہمنوں سے تعلق رکھتے تھے۔کم عمری میں ہی فطری طبیعت اور ذہانت سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ان کی شہرت ''مثنوی گلزارِ نسیم'' کی وجہ سے ہوئی۔ان کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہے پھر بھی ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلیں، مخمس اور ترجیع بند ہیں۔سرور جہاں آبادی (پ:1873ء،م:1910ء =37سال) کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔فطری شاعر ہونے کی وجہ سے ابتدائی دور سے ہی معیاری شاعری کی۔ان کے دو شعری مجموعے ''خمخانہ ٔسرور''، ''جامِ سرور'' بہت ہی مشہور ہیں۔چکبستؔ لکھنوی (پ:1882ء،م:1926ء=44سال) کے آباء اجداد کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ان کو نظم گو شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی نظموں میں حبِ وطن ،قومی بیداری، جذبہ آزادی اور فرقہ وارانہ اتحاد ملتا ہے۔رامائن کے قصے کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''صبح وطن'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔اختر شیرانی (پ:1905ء،م:1948ء = 43سال) کی رومانی شاعری سے کون واقف نہیں۔انہوں نے عالم شباب میں ہی کئی تصانیف اردو شعر و ادب کو دیں۔ان

میں شعرستان، صبحِ بہارِ نغمہ، طیور آوارہ، لالۂ طور، پھولوں کا گیت (بچوں کے لئے) قابلِ ذکر ہیں۔ان کے فلمی نغمے آج بھی اپنی جاذبیت کی وجہ سے مشہور ہیں۔مجازؔ لکھنوی (پ:1911ء،م:1955ء=44سال) ترقی پسند تحریک کے علمبردار شاعر ہیں۔ان کے کلام میں بیک وقت لطافتِ زباں، جوش و انقلاب اور رومانیت کے جذبات شدت سے ملتے ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے آہنگ، سازِ نو اور شبِ تاب شائع ہو چکے ہیں۔میراجی (پ:1912ء م:1949ء=37سال) کشمیری النسل شاعر ہیں۔زندگی کی کل سینتیس بہاریں دیکھیں۔قلیل عمر پانے کے باوجود بہت لکھا۔ان کا کلیات جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتّب کیا ہے،۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تصانیف میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸)، اس نظم میں (۱۹۴۴) ،نگارخانہ (۱۹۵۰) ،خیمے کے آس پاس (۱۹۶۴) شامل ہیں۔ناصرؔ کاظمی (پ:1925،م:1972ء=47سال) نے اردو غزل کو جو موضوعاتی بلندی عطا کی ،اس کے لئے ان کو ہمیشہ ''میرؔ کا ثانی'' تسلیم کیا جاتا ہے۔انہوں نے اردو غزل میں تاریخی شعور، جذباتی وفور اور مترنم بحور کا فن کارانہ نمونہ پیش کیا۔ان کی دو تصانیف ''برگ نَے'' اور'' دیوان'' شائع ہو چکی ہیں۔پروین شاکرؔ (پ:1952ء ،م: 1994ء=42سال) کا نام سنتے ہی نئے لب و لہجے کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے جس طرح نسوانیت کی ترجمانی کی ہے اس کی مثال پورے شعر و ادب میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ان کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔جن میں انکار،خود کلامی،صد برگ ،خوشبو قابلِ ذکر ہیں اب تو ''ماہِ تمام'' کے نام سے ان کا کلیات بھی ملتا ہے۔بعض شعراء نے پچاس کے آس پاس کی عمر ہی پائی،ان میں مومن خاں مومن (52سال)،خلیل الرحمان اعظمی (51سال)،اصغر گونڈی (50سال) وغیرہ شامل ہیں۔

میرے استاد محترم مرحوم فرید پربتی (پ: 1962ء، م: 2011ء =50سال) جو خود جواں مرگ شعراء کی فہرست کا حصے بنے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعر کی عمر کے تین ادوار ہوتے ہیں۔ پہلا دور تیس سال سے چالیس سال تک کا عرصہ ہوتا ہے جو شاعر کے لئے نوجوانی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس دور میں تاثرات کی کمی نہیں ہوتی لیکن تمام تاثرات واضح اور نمایاں نہیں ہوتے۔ دوسرا دور چالیس سال سے پچاس سال تک ہوتا ہے۔ اس دور کو شعروسخن میں جوانی کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں فکر واحساس اور الفاظ و اسلوب کے درمیان یک گونہ توازن پیدا ہوتا جاتا ہے۔ وہ معناً بھی قیمتی اور وزنی معلوم ہوتا ہے۔ اسلوبِ بیان میں بھی زیادہ صفائی، شگفتگی، روانی اور انجام نمایاں ہوتا ہے۔ تیسرا دور پچاس کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں شاعر بقولِ عرفؔی ''کوثر و تسنیم'' کی لہروں میں تیرنے لگتا ہے۔ اس دور میں شاعر کو ایک ایک شعر میں متعدد پہلو پیشِ نظر رہتے ہیں۔ دل و دماغ میں شعر سے جو مناسبت پیدا ہوتی ہے وہ بے قصد وارادہ شاعر کی فطری خصوصیتوں کے مطابق کارفرما رہتی ہے۔

مجھے جنید جاذبؔ کی وہ بات بھلی لگتی ہے کہ جنیوئن لوگ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے۔ بلکہ وہ کم عمری میں ہی وہ مقام حاصل کرتے ہیں جن کی خاطر بعض لوگ بڑی تگ ودو کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے قدرت ان سے زیادہ کام لیتی ہے تاکہ ان کو کم عمری کا گلا نہ رہے۔

......●......

پوچھو بہتے پانی سے

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے کیڑے بچپن میں ہی پروان چڑھتے ہیں۔اس مقولہ کے مصداق جب میں نے کچھ ٹوٹی پھوٹی نظمیں لکھیں تو دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میری تحریریں بھی اخباروں کی زینت بنیں۔لیکن میری اتنی ہمت نہیں بندھتی کہ کسی اخبار کو اپنی تحریر اشاعت کے لئے ارسال کرسکوں۔آہستہ آہستہ میرے اندر ایک ننھا سا اعتماد پیدا ہوا۔پھر میں نے کچھ تحریریں اشاعت کے لئے مقامی روزناموں میں بھیج دیں۔لیکن کوئی تحریر منصۂ شہود پر نہ آسکی۔تذبذب اور کشمکش کی الجھن سے نجات پانے کے لئے میں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی ٹھان لی۔اسی تلاش میں میری ملاقات ریاست کے اردو افسانہ نگار مشتاق مہدی سے ہوئی۔انہوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ان کا یہ جملہ آج بھی میرے لئے مشعل راہ ہے کہ کوئی بھی وہ لفظ جس کے صحیح معنی معلوم نہ ہوں کبھی بھی نہ لکھیں۔مہدی صاحب کے یہاں دو ایک نشستوں میں مجھے کافی کچھ سیکھنے کو ملا اور اس بات کی تشفی بھی ہوئی کہ ابتدائی تحریریں ضروری نہیں کی وہ کہیں شائع ہوں۔جس سے میرا تذبذب قدرے کم ہوا اور میں مطالعہ و مشاہدہ میں مگن ہوگیا۔

تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب نوآموز ادیبوں کی تخلیقات رد ہوئیں ہیں اور پھر وہیں ادیب آگے چل کر رسالوں میں چھائے بھی رہیں ہیں۔رسائل کے

حوالے سے کشمیر کے ادباء وشعراء ہمیشہ بدنصیب رہے ہیں کیونکہ یہاں کوئی ادبی رسالہ متواتر نہیں نکلا ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو باہر کے رسائل میں چھپنے کے لئے بڑی تگ ودو کرنا پڑتی ہے۔ باہر کے رسالوں میں جگہ پانا اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہاں ملکی سطح پر کلام دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ستم ظریفی کہ وہ غیر اہل زبان کو درخور اعتناء بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اچھا اور معیاری ادب کہیں بھی تخلیق ہوسکتا ہے۔

اس حوالے سے جب ہم ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے یہاں کے ادباء اور شعراء کس طرح اپنی تخلیق کو منظر عام پر لاتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں صرف دو رسالے عروج پر تھے۔ لاہور سے مولوی صلاح الدین ''ادبی دنیا'' اور پنجاب سے جوش ملیح آبادی ''کلیم'' نکالا کرتے تھے۔ ان رسائل میں اساتذہ کا کلام شائع ہوتا تھا جو زبان وبیان کی غلطی قابلِ معافی نہیں سمجھتے تھے۔ مزاج ومنہاج کا معیار آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ فیض احمد فیض ،سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی ، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، حفیظ جالندھری، اختر انصاری، احتشام حسین، سردار جعفری، کلیم الدین احمد، مجنون گھورکھپوری، قاضی عبدالودود وغیرہ جیسی شخصیات کو اپنی تحریریں شائع کرنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ معرکوں اور مباحثوں کا لامتناہی سلسلہ قسط وار چلتا تھا۔ اور اس دور میں نو آموز کی ان رسائل میں جگہ بنانا بذاتِ خود ایک کارنامہ ہوا کرتا تھا۔ اساتذہ شعراء وادباء سے اپنا لوہا منوانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن کشمیری ادیبوں نے یہ معرکے بھی بڑی ہمت اور تن دہی سے سر کئے۔ اس سلسلے میں یہاں پر دو شخصیتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اپنی ابتدائی تحریروں سے ادبی حلقوں میں سراسیمگی پھیلادی۔ ان میں ایک شاعر اور ایک افسانہ نگار ہیں۔ جن کے بغیر کشمیر کی ادبی تاریخ نامکمل ہے۔

غلام رسول نازکی نے جب اپنا ابتدائی کلام لاہور کے مشہور ادبی رسالہ ''ادبی دنیا'' کو بھیجا۔ ایڈیٹر نے ان کا کلام یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ ہم اس کو شائع نہیں کر سکتے۔ نازکی صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور یہی غزل جوش ملیح آبادی کے رسالے ''کلیم'' کو روانہ کی۔ جس کو جوش نے اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ پہلے صفحہ پر شائع کر کے یہ نوٹ لکھا کہ ہمیں خوشی ہے کہ کشمیر کے دور دراز علاقے میں بھی اتنی معیاری شاعری ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا غلام رسول نازکی نے کبھی پیچھے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ ان کا فارسی کلام ایران کی یونیورسٹی کے سیلبس (syllabus) میں رکھا گیا۔ اس کے علاوہ روس کی کلچرل سوسائٹی نے ''فارسی شعری انتھالوجی'' میں کلام شامل کیا۔

جب پریم ناتھ پردیسی نے ریاست میں اردو افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی تو اس دور میں جن افسانہ نگاروں نے پردیسی کے بعد اردو افسانہ کو عروج کی منزلوں تک پہنچایا ان میں پریم ناتھ در سر فہرست ہیں۔ پریم ناتھ در نے اپنا افسانہ ''غلط فہمی'' لاہور کے مشہور و معروف اردو ادبی رسالہ ''ادبی دنیا'' کو ارسال کیا، تو رسالہ کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین نے باضابطہ اپنے اداریہ میں ان بڑے افسانہ نگاروں کو خبردار کیا جو بزعم خود کسی افسانہ نگار کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''پریم ناتھ در ہمارے افسانوی افق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے اور اگر وہ نوجوان ہے تو پھر ہمارے موجودہ استادوں کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا''

ابھی مولانا صلاح الدین نے پیش گوئی ہی کی تھی کہ ''ادبی دنیا'' کے اگلے شمارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

''میں نے در کے بارے میں جو پیشن گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوگئی، کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے عظیم

افسانے لکھے ہیں وہ آئیں اور دیکھیں افسانے یہ ہوتے ہیں۔
''چائے کی پیالی'' کو داخلیت اور نفسی تجزیہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان
لیں کہ اس معیار کے حدود ابھی اور آگے ہیں''۔

متذکرہٗ بالا واقعات سے یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ نوعمر اور نوآموز قلمکاروں میں اگر آگے بڑھنے کی جستجو ہوں تو وہ اپنی منزل ضرور پاتے ہیں۔ بقول شاعر

رستہ کیسے بنتا ہے
پوچھو بہتے پانی سے

اس کے برعکس آج کی نئی نسل جب اپنی کوئی تخلیق کسی رسالہ یا اخبار کو ارسال کرتی ہے تو فن پارہ شائع نہ ہونے پر لکھنا ہی چھوڑ دیتی ہے اور ساتھ ہی محنت کرنے سے گھبراتی بھی ہے۔ جو ایک صحیح روش نہیں ہے بلکہ دوسروں کی تحریروں سے اخذ واستفادہ کے مراحل طے کرنے سے ادبی نروان ملتا ہے۔ اس بات کی تصدیق روسی قلم کار انتن چیخوف کے اس مقولے سے ہوتی ہے کہ ''تخلیق کار کیلئے مطالعہ ومشاہدہ آبِ حیات کی مانند ہیں اور عمر جاوداں پانے کے لئے کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے رہنا شرطِ اول ہے۔''

......●......

ممکن نہیں کہ سرد ہو!!

''ارمغان کاشمر'' ان نوعمر قلم کاروں کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب کے افق پر دلیل صبح کی طرح روشن ہورہے ہیں۔ ان نوعمر قلمکاروں سے اردو ادب کا مستقبل وابستہ ہے اور ان کی موجودہ جستجو و آرزو قائم و دائم رہی، تو یہ یقینی امر ہے کہ یہ سرزمین کاشمر میں اردو و ادب کے آسمان کو منور کردیں گے اور اردو ادب کو اپنی نگارشات سے مالا مال کرنے والوں میں شمار ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ہمت و عزم اور انہیں ان کے پرخلوص ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے''۔

یہ پیغام خواجہ ثناء اللہ بٹ نے ستر کی دہائی میں چھپی ایک افسانوی انتھالوجی ''ارمغان کاشمر'' کے لئے دیا تھا۔ اس کتاب کو کشمیر کے معروف معالج ڈاکٹر بشیر گاش نے مرتب کیا۔ جب گاش صاحب نئی نسل کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو ''ارمغان شباب'' کے عنوان سے کتابی شکل دینے کے سلسلے میں خواجہ ثنا اللہ بٹ سے ملاقی ہوئے۔ تو خواجہ صاحب نے کچھ دیر سوچ کر کہا، کہ کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس کا عنوان ''ارمغان کاشمر'' رکھتے۔

گاش صاحب نے اُس دور کے نوجوان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو ایک لڑی میں یہ کہہ کر پرو دیا تھا کہ کہنہ مشق افسانہ نگار نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ نو آموز سمجھ کر

نظر انداز کرتے ہیں۔ گاش صاحب کے لکھے ہوئے دیپاچے کی ایک سطر سطر کی معنویت اور اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ انہوں نے جذباتی اور جارہانہ انداز میں کہنہ مشق ادیبوں سے گلہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب تک آپ نئے لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا نہیں کریں گے تو وہ کیسے پنپ سکتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ چار دہائیاں گزرنے کے بعد بھی وہی صورت حال آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ ہر دور میں چہرے بدلتے ہیں صورت حال نہیں۔

خواجہ صاحب نئی نسل کو کتنا عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ خواجہ صاحب کے درج بالا پیغام سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ''آفتاب'' کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم دیا، جس سے نوخیز ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ سامنے آئی۔ یہ دور اس حوالے سے ذرخیز تھا کہ لکھنے والوں نے نئے رجحانات اور نئے میلانات کے تحت اپنی تخلیقی پیاس بجھانی شروع کر دی تھی۔ یہاں کے ادبی ماحول میں گھما گھمی پیدا ہوگئی تھی۔ آفتاب کے ادبی صفحات ادیبوں کے لئے وقف تھے۔ ''آفتاب'' کی بدولت لکھنے والوں کا ایک بڑا کاررواں سامنے آیا جس میں اکثر و بیشتر ادباء وشعراء ملکی سطح پر اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ لیکن ہم ان لکھنے والوں کو بھی فراموش نہیں کر سکتے جنہوں نے اس دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا۔ جس کو دیکھ کر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ دور کشمیر میں تخلیقی ادب کے حوالے سے ایک ذریں دور رہا ہے۔

خواجہ صاحب خود ایک صاحب طرز صحافی تھے۔ علم و ادب سے گہرا تعلق تھا۔ سیاسیات وسماجیات کے ساتھ ساتھ ادبیات سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ خصوصاً علامہ اقبال سے قلبی مناسبت رکھتے تھے۔ اسی لئے اپنے ادارتی کالم کے سرنامے کے طور پر علامہ اقبال کا یہ شعر ہمیشہ لکھتے آئے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اسکے علاوہ اپنے فکاہیہ کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کا عنوان بھی علامہ کے شعر سے ہی مستعار لیا تھا۔اس کالم میں زبان کی چاشنی اور موضوع کی تازگی قاری کو آخر تک گرفت میں رکھتی ہے۔ مقفیٰ و مسجع نثر کے اسلوب میں حالات وواقعات کی عکاسی کرنا خواجہ صاحب کا روز کا معمول بن چکا تھا۔اگر چہ کئی صحافیوں نے اس روش میں خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کی لیکن جو ذائقہ خواجہ صاحب کے انداز میں تھا وہ کہاں سے لاتے۔ جس طرح فکرتونسوی ''پیاز کے چھلکے'' لکھ کر لوگوں کے آنسوں پونچھتے تھے اسی طرح خواجہ صاحب ولر کے کنارے ہنسی کے فوارے پیدا کرتے تھے۔خواجہ صاحب ایک جوہری کی طرح نئی نسل کے ہیروں کی تراش خراش کرکے ان کو ڈائیمنڈ بنا کر بازار میں اس نیت سے چھوڑ دیتے تھے کہ اب ان کو اپنی قیمت کا اندازہ ہو گیا ہے۔اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو گا کہ ریاست کے پرنٹ میڈیا میں جو بھی نام روشن ہوئے،ان میں اکثر آفتاب کی درس گاہ سے ہی فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔اس بات کی تصدیق بشیر گاش اپنی مرتبہ کتاب ''ارمغان کاشمر'' کے دیپاچے میں یوں کرتے ہیں۔

''جوہریوں کی اس وادی میں بھی کوئی کمی نہیں،لیکن یہ لوگ وہی ہیرے خریدتے ہیں جن میں محنت نہیں کرنا پڑتی۔اب کون ٹیڑھے میڑھے پتھر کے ٹکڑے خریدے،انکی تراش خراش میں وقت اور طاقت ضائع کرے،انہیں چمکائے اور دنیا کے سامنے پیش کرے۔اس لئے یہ خام ہیرے کباڑیوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں اور کبھی جب نیلام بھی کردئے جاتے ہیں تو بولی پندرہ روپے سے اوپر کبھی نہیں جاتی۔ اس کباڑ خانے کی کئی شاخیں ہیں۔مدیر آفتاب خواجہ ثناءاللہ بٹ اس کباڑی بازار کے واحد جوہری ہے جو ناتراشیدہ

ہیرے قبول کرتا ہے، انہیں جلا بخشتا ہے مگر پھر انہیں منڈی میں پھینک کر بھول جاتا ہے کہ آگے ردی خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے جو پرانے، استعمال شدہ اور بوسیدہ مال کی تجارت کرتے ہیں۔اس مجموعے (ارمغان کاشمر) کے تمام شرکاء ''آفتاب'' کے ذریعہ ہی میدان ادب میں داخل ہوئے تھے اور اگر ہماری بزم میں سے کسی نے نام بھی پیدا کیا تو تاریخ اس ادب ساز کو یاد کرے گی لیکن وہ بھی اپنے اور نوجوان ادباء کے درمیان ایک ''محترم فاصلہ'' رکھتے ہیں جو بعض اوقات ایک ایسی خلیج بن جاتا ہے کہ جسے پاٹنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے''۔

......●......

زانوئے ادب تہہ کرنا شرطِ اول

گریجویشن میں نصابی اردو پڑھنے کے بعد مجھے اردو شاعری کرنے کا چسکا لگا۔ پہلے پہل تک بندی کرنے کے لئے لغت سے ہم آہنگ الفاظ لکھ کر من گھڑت شعری جملے تراشنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاعری کا جنون اس حد تک ہوگیا کہ نصابی تعلیم اثر انداز ہونے لگی۔ گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود چوری چھپے ایک ڈائری ترتیب دینے لگا۔ روز نت نئے اشعار لکھنے کی تگ ودو میں صفحہ قرطاس سیاہ کرنے میں گھنٹوں مصروف عمل رہتا۔ چند کتابوں کے مطالعہ کے بعد پتا چلا کہ شاعری ردیف وقافیہ کا نام نہیں بلکہ ''شعر چیزے دیگر است'' کے مترادف ایک ایسی دنیا ہے جس کی تخلیق کے لئے شعوری کوششوں کے علاوہ فطری رجحان ہونا اتنا ضروری ہے جتنا ایک انسان کیلئے پانی اور ہوا ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں کسبی نہیں بلکہ وہبی ہیں۔ اسی دوران مجھے کمال احمد صدیقی کی کتاب ''عروض اور آہنگ'' پڑھنے کا موقعہ ملا۔ پیش لفظ پڑھ کر ہی اندازہ ہوا کہ عروض کی بھول بھلیوں سے نکلنا آسان نہیں۔ پھر بھی میں نے ہمت کر کے بحروں کے اوازن اور ارکان سمجھنے کی کوشش کی، لیکن بعض جگہ عروض کا معاملہ ریاضی کی طرح پیچیدہ اور گنجلک لگا۔ تو میں نے غزل کے بجائے آزاد نظم میں طبع آزمائی شروع کی لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ آزاد نظم کا بھی ایک باقاعدہ عروضی نظام ہوتا ہے۔ اسی لئے نثر لکھنے پر اکتفا کیا۔

دوران مطالعہ مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ شاعری کے اسرار و رموز سیکھنے کے لئے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا شرطِ اول ہے۔ ہر دور میں اساتذہ کی ایک روایت رہی ہے جو اپنے شاگردوں کو شاعری کے محاسن و معائب سے آشنا کرتے تھے، کلام کی باریکیوں سے روشناس کراتے تا کہ شاگرد میں شعر کہنے کا سلیقہ اور ہنر بخوبی آجائے۔ ورنہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بننے میں دیر نہیں لگتی۔

آپ کہ یہ جان کر تعجب ہوگا کہ عرب میں شاعری شروع کرنے کے لئے باضابطہ استاد سے اجازت لی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں عربی زبان کے رجحان ساز شاعر ابونواس کا واقعہ بہت ہی مشہور ہے۔ جب انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں ایک بار اپنے استاد خلف الاحمر سے شعر گوئی کی اجازت چاہی۔ تو خلف الاحمر نے کہا کہ میں تمہیں اس وقت تک اجازت نہیں دے سکتا جب تک کہ تم قدیم شعرائے عرب کے ایک ہزار اشعار حفظ نہ کرلو اور ان میں گیت، قصیدہ اور فردیات سب کچھ ہونا چاہیے۔ ابونواس یہ حکم سن کر ایک مدت کے لئے گوشہ نشین ہوگیا اور عرصہ طویل کے بعد حاضر ہو کر اس نے استاد سے کہا:

''جناب، میں آپ کا حکم بجالایا۔''

''تو سناؤ''۔ خلف الاحمر نے کہا۔

ابونواس نے اشعار سنانے شروع کیے اور کئی دن کی مدت میں اس نے اپنے یاد کئے ہوئے زیادہ تر اشعار سناڈالے اور پھر اپنی درخواست کا اعادہ کیا کہ مجھے شعر کہنے کی اجازت عطا فرمائیں۔

''اجازت نہیں مل سکتی''۔ خلف الاحمر نے کہا۔ ''تاوقت کہ تم وہ سب اشعار اپنے حافظے سے اس طرح محو کردو گویا تم نے انہیں کبھی یاد ہی نہ کیا تھا۔''

''استاد، یہ تو بہت مشکل ہے''۔ ابونواس نے کہا۔ ''میں نے تو یہ اشعار بڑی

محنت کر کے اچھی طرح یاد کر لئے ہیں۔''

خلف الاحمر نے صاف کہا کہ''جب تک تم انہیں بھلاؤ گے نہیں، تب تک تمہیں شاعری کی اجازت نہیں ملے گی''۔

بیچارہ ابونواس دوبارہ کسی خانقاہ میں چھپا رہا اور بہت مدت وہاں پڑا رہا، جب تک وہ سارے اشعار اس کی یاد سے محو نہ ہو گئے۔ تب کہیں باہر نکل کر وہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا:

''استاد میں نے وہ اشعار اس طرح بھلا دیئے ہیں گویا میں نے انہیں کبھی یاد ہی نہ کیا تھا''۔

''اچھا تو جاؤ''۔ خلف نے کہا''اب شعر کہو''۔

استاد اور شاگرد کے رشتے پر بات کرتے ہوئے اردو کے معروف محقق ڈاکٹر یعقوب عامر لکھتے ہیں:

''شاعری کے فن میں استادی اور شاگردی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جہاں کسی شاعر کے لئے فخر کی بات تھی کہ وہ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد سے تلمذ رکھتا۔ وہاں استاد بھی اس بات پر ناز کرتا کہ اس کا شاگرد ہونہار اور ذہین ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس بات کو قابل ذکر سمجھتے تھے کہ فلاں فلاں کا شاگرد ہے، بغیر استاد کے کسی شاعر کو بہت کم امتیاز حاصل ہوتا تھا۔''

ادبی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ اردو ادب میں باقاعدہ اصلاح سخن کی تحریک بھی چلی ہے یہاں تک کہ دلی دبستان اور لکھنو دبستان کی بنیاد میں اصلاح سخن کی تحریک ریڈ کی ہڈی کی مانند ہے۔ جگہ جگہ ایسی تربیت گاہیں تھیں جہاں شعراء ایک دوسرے سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عنوان چستی ایسی تربیت گاہوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اصلاح سخن کی تحریک کے پروان چڑھنے کے بعد دہلی میں ایک ہی وقت میں اردو شاعری کی چار تربیت گاہیں نظر آتی ہیں۔ان میں پہلی تربیت گاہ خان آرزو کا مکان، دوسری شاہ تسلیم کا تکیہ، تیسری خواجہ میر درؔد کی خانقاہ اور چوتھی میر تقی میؔر کی ڈیوڑھی ہے''۔

میں جانتا ہوں کہ میری طرح ہزاروں ایسے نوجوان ہونگے ،جن کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوگی کہ ان کے اشعار بھی اخباروں اور رسالوں کی زینت بنیں، کہنہ مشق شعراء ان کی طرف متوجہ ہوں یا کم از کم اتنی خفت نہ اُٹھانی پڑے کہ شعر ٹوٹ رہا ہو۔اکثر و بیشتر نام نہاد شعراء نوعمر و نوآموز کو استادی دکھانے کے لئے یہی جملہ رٹتے رہتے ہیں کہ ''شعر ٹوٹ رہا ہے''۔جس سے نوآموز شاعر پہلے ہی مرحلے سے پست ہمت ہو جاتا ہے اور وہ شاعری کرنا ترک کر دیتا ہے۔جب کہ ایسا ہونا چاہئے کہ کہنہ مشق شعراء اصلاح سخن کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نوآموز شعراء کی تربیت کرتے اور ایک نئی نسل کو سامنے لانے میں اپنا رول نبھاتے مگر افسوس ریاست میں اس نوعیت کی کوئی ادبی تحریک نہیں پنپ سکی۔اسی لئے شاید ہم سنجیدہ لکھنے والوں میں اضافہ نہیں کر پاتے ہیں۔



SAREERI-KHAMA

A COLLECTION OF LITERARY COLUMNS

Columnist: Mohammad Salim Salik

محمد سلیم سالکؔ کی کتابیں

creativestar
PUBLICATIONS
Jamia Nagar, New Delhi-110025
+91 9958380431 +91 8851148278

ISBN: 9789387884540



